مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰ روپے　　فی شمارہ ۱۲ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　　ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:　حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۲ ماہ رمضان المبارک ۱۴۲۴ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۰۳ء عدد ۵

فہرست مضامین

شذرات

مسلمانوں کی سرپرستی نے جن علوم کو بام عروج پر پہنچایا تھا، ان میں یونانی طب بھی ہے اس کی بہ دولت جو حکما، دانش ور اور سائنس داں پیدا ہوئے ان کے کارناموں سے ابھی تک گنبد مینا پرشور ہے اور ان کی مسیحائی کے چرچے اب بھی ہورہے ہیں، ہندوستان میں بھی صدیوں اس فن کا بول بالا رہا اور اسی کو سب سے مفید، ارزاں اور کامیاب طریقہ علاج سمجھا جاتا تھا، آزادی سے قبل تک اکثر مرکزی شہروں میں طبیہ کالج قایم تھے جو اس فن کو فروغ اور حاذق اطبا پیدا کررہے تھے، مگر جب ایلوپیتھک کا رواج ہوا اور حکومت کو اس کی سرپرستی حاصل ہوئی تو طب یونانی کا چراغ ٹمٹمانے لگا مگر اب ایلوپیتھک کی تعمیر میں مضمر بعض خرابیاں اور مضرتیں سامنے آرہی ہیں تو طب کی جانب پھر لوگوں کا رجحان ہوا ہے اور وہ اس کی اہمیت وافادیت کو سمجھنے لگے ہیں، طب کا زیادہ ذخیرہ عربی وفارسی میں ہے اور اس کے اصول ونظریات کو سمجھنے کے لیے منطق وفلسفہ کا علم بھی ضروری ہے، ان فنون اور عربی وفارسی زبانوں کی تعلیم عربی درس گاہوں ہی میں زیادہ بہتر ہوتی ہے اس لیے ان کے طلبہ طب کے اصول وکلیات کو سمجھنے اور اخذ کرنے میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں، سائنس کی اہمیت بڑھ جانے کے بعد بھی سائنس پڑھے طلبہ کے ساتھ مدارس کے طلبہ کو بھی طبیہ کالجوں میں داخلہ دیا جاتا تھا۔

اب صرف جامعہ ہمدرد دہلی اور اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ میں مدارس کے طلبہ کو بی۔یو۔ایم۔ایس سے پہلے ایک سالہ پری طب کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے اور سائنس پڑھ کر آنے والے طلبہ کا داخلہ براہ راست بی۔یو۔ایم۔ایس میں کردیا جاتا ہے، یہ رعایت اور طبی کالجوں کو بھی ملنی چاہیے تھی تاکہ ان میں مدارس کے طلبہ کا داخلہ ہوسکے اور وہ جدید طب سے واقف ہوں، مگر جامعہ ہمدرد کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ طبی تعلیم کا انتظام کرنے والی حکومت ہند کی قایم کردہ باڈی سینٹرل کونسل آف میڈیسن نے گزشتہ سال طبیہ کالجوں میں پری طب کورس چلانے پر پابندی عاید کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور خدشہ ہے کہ اسے مرکزی حکومت کے شعبہ انڈین میڈیسن وزارت صحت وخاندانی بہبود کے ذریعہ جلد ہی سرکاری گزٹ میں نوٹی فائی کردیا جائے گا جس کے بعد مدارس کے طلبہ کے لیے طبیہ کالجوں کے دروازے بالکل بند ہوجائیں گے، اس سے طب کا بھی نقصان ہوگا اور طلبہ ایک بہتر پروفیشنل کورس سے محروم ہوجائیں گے، جامعہ ہمدرد دہلی کے کنونشن سینٹر میں ۹؍اکتوبر کو مدارس کے منتظمین اور طبی درس گاہوں کے ذمہ داروں کا ایک مذاکرہ رکھا گیا تھا

جس کا دعوت نامہ تاخیر سے ملا اور اخباروں میں اس کی کوئی خبر نہیں پڑھی، طب یونانی سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں، حکمت مسلمانوں کی گم شدہ متاع ہے، انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس سے سارے عالم کو فیض یاب کیا مگر مسلم دشمنی حکومت کی گھٹی میں پڑی ہے، وہ کھوج کھوج کر ان کو ضرر پہنچانے اور تعلیمی، سماجی و اقتصادی حیثیت سے پس ماندہ کردینے والے اقدامات کررہی ہے، آخر کس کس زیادتی کی فریاد کی جائے اور کس کس زخم کا مرہم تلاش کیا جائے ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔

حکومت تعلیم کی جدید کاری کے نام پر مسلمانوں کو دینی مدارس میں جدید علوم اور سائنس کو داخل نصاب کرنے کے لیے بے چین نظر آتی ہے مگر اس سے اس کا اصل مقصد مدارس کی روح اور ان کے امتیازات و خصایص کو ختم کردینا ہے، اگر حکومت واقعی مخلص اور نیک نیت ہوتی تو آئے دن مسلمانوں کو پریشان کرنے والے اقدامات نہ کرتی اور ان سے تعلق کی وجہ سے طب یونانی کو نیست ونابود کردینے والا فیصلہ نہ کرتی، وہ تو ملک کو سائنس وٹکنالوجی کے دور سے نکال کر پراچین کال میں لے جانا اور دیومالائی تصورات وتوہمات پرمبنی تعلیم کو فروغ دینا چاہتی ہے، وزیر تعلیم ایک زمانے سے یونیورسٹیوں کے نصاب میں نجوم وجوتش ودیا اور ویدک سائنس پڑھانے کے لیے فکرمند ہیں اور اب ان کے نایب وزیر مملکت سنجے پاسوان ان سے بھی آگے جاکر جادوٹونا، ٹوٹکا، تنتر منتر، جھاڑ پھونک، سفلیات اور خرافات کو اسکولوں کے نصاب میں شامل کرکے پراچین بھارت کے ان نادر علوم کو زندہ کرنا چاہتے ہیں، اخباروں میں یہ خبر بھی آئی تھی کہ وہ اپنے گلے میں کئی عدد کوبرا سانپ لپیٹے دہکتی آگ میں رقص فرمانے لگے تھے، ووٹوں کی سیاست نے ایسے ضعیف الاعتقاد اور توہم پرستوں کو منصب وزارت پر فایز کردیا ہے، جو تعلیم کی جدید کاری کیا کریں گے، وہ تو سحر وشعبدہ کی تعلیم دے کر مسلمانوں کی چھاپ ختم کرنا چاہتے ہیں۔

موجودہ حکومت ملک کو زعفرانی رنگ میں رنگنے کے لیے اس کی تاریخ مسخ کررہی ہے، نصاب سے سیکولر کتابوں کو نکال کر ہندو دھرم کا پرچار کرنے والی کتابیں اس میں شامل کررہی ہے، اس نے تازہ ستم یہ ایجاد کیا ہے کہ بارہویں درجے کے سی۔بی۔ایس۔ای کے نصاب ۲۰۰۳ء میں اردو کے مایہ ناز مصنف وناول نگار منشی پریم چند کے مشہور ناول ''نرملا'' کو نکال کر بی جے پی کی ایک کارکن اور عورتوں کی شاخ کی سرگرم خاتون کا ناول ''جیوں مہندی کے رنگ'' شامل کردیا، نصاب میں تھوڑا ردوبدل ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے پس پردہ جو ذہنیت اور تنگ نظری کام کررہی ہے، اس نے ایک مشہور ناول نگار کی کتاب کی جگہ اسی پایے کے مصنف کی کتاب کو شامل کرنے کے بجائے ایک گم نام مصنفہ کا ناول شامل کردیا،

کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی، اس ناول کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ معمولی اور پھس پھسا ہے، اس پر ہندو مذہب کا روغن چڑھا ہوا ہے، سنسکرت کے شلوک اور ''جے میا گنگا'' وغیرہ جیسے نعروں سے بھرا ہوا ہے، اس کے برعکس منشی جی کے ناول ہم نے خود پڑھے ہیں، ان میں دیہاتی و قصباتی زندگی، سماج میں ہونے والے ظلم و استحصال، طبقہ نسواں پر ہونے والی زیادتی و ناانصافی اور قبیح رسم و رواج کی تصویر کشی کی گئی ہے، میل ملاپ، اخوت اور ہمدردی کے جذبات ابھارے گئے ہیں، وہ ہمارے مشترکہ کلچر اور گاندھیائی فکر و فلسفہ کے ترجمان ہیں، نصاب سے نکالا جانے والا یہ ناول ''نرملا'' عورتوں میں بہت مقبول ہے لیکن اب رنگ محفل بدل چکا ہے، ہندو وادی طاقتیں گاندھی اور پریم چند سے رشتہ کاٹ کر ملک کو پراچین کال میں لے جانا چاہتی ہیں، ہندو مذہب کے پرچار کے لیے ناول لکھنا غلط نہیں ہے لیکن سیکولر نصاب میں اسے شامل کیا جانا تعصب اور تنگ نظری ہے۔

دارالمصنفین کے قیام کو تقریباً ۹۰ برس ہو گئے، اس طویل مدت میں وہ بڑے سرد و گرم حالات سے گزرا مگر کبھی اس نے اپنی وضع و روش سے ہٹنا پسند نہیں کیا ؎

ہر جلوہ مرا نتواند فریب داد پروانۂ چراغ سر طور بودہ ایم

شہرت و ترقی کے سستے اور مروجہ طریقوں کو اختیار کیے بغیر وہ خاموشی سے اپنے مذہب، اسلامی علوم و تاریخ اور اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دیتا رہا، اس ایثار، قناعت اور قربانی کی وجہ سے اس کی مطبوعات کو لازوال شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور اس کا آوازہ شہرت ہندوستان سے گزر کر اسلامی اور یورپ و امریکہ کے ملکوں میں جا پہنچا، علامہ شبلیؒ اور ان کے تلامذہ پر کتابوں اور مضامین کے انبار لگ گئے، متعدد یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے گئے، خود دارالمصنفین کو بھی موضوع تحقیق بنایا گیا اور اس پر متعدد بلند پایہ کتابیں چھپ چکی ہیں، حال ہی میں جناب نذیر احمد قریشی کو امراوتی یونیورسٹی نے ان کے مقالے ''اردو نثر کے ارتقا میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کی خدمات'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے، قریشی صاحب مہاراشٹر کے دور دراز علاقے ضلع واشم کے باشندے ہیں جن کو اردو ادب کا اچھا ذوق ہے، وہ تلاش و تحقیق اور محنت و عرق ریزی کے عادی ہیں، یہ مقالہ بھی ان کی برسوں کی کد و کاوش کا نتیجہ ہے جو ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کی نگرانی میں لکھا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب اچھے محقق و اہل قلم اور دارالمصنفین کے عاشق و شیدائی ہیں، ہم اور کارکنان دارالمصنفین دونوں حضرات کو تہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔

☆☆☆

مقالات

جاہلی عہد میں حنیفیت

(۲)

از پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی☆

بنو سُلیم مکہ اور یثرب کے درمیانی علاقہ بنو سلیم کا خاندانی وطن آباد تھا، یہ قیس عیلان قبیلہ کا عظیم ترین جزو تھا، ان کے مکہ اور یثرب دونوں سے قریبی تعلقات تھے، بنو سلیم کی ایک شاخ تو بنو ہاشم کی حلیف و معاون بھی رہی تھی، وہ اپنی عددی قوت، فوجی طاقت بالخصوص شہ سواروں کے لیے ممتاز تھے اور ان میں مردانِ کار کی بھی کمی نہیں تھی، ان میں سے بعض کے ہاں حنیفیت کا رجحان پایا جاتا تھا، وہ اپنی عرب موحدانہ روایات کے لیے معروف تھے اور دوسری عرب اقدار کے لیے بھی۔ (عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت، باب دوم، ۱۴۰-۱۴۳ اور اس کے حواشی)

حضرت عمرو بن عبسہ سُلَمی مشہور صحابی ہیں لیکن اسلام لانے سے قبل ہی وہ بتوں کی پرستش سے بے زار ہو گئے تھے، ''امام احمد نے ان کا اپنا قول نقل کیا ہے کہ میں جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کو گمراہی پر سمجھتا تھا اور بتوں کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ کچھ نہیں ہیں''، ان کا ایک اور قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ ''میرے دل میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ بتوں کی پرستش باطل ہے، ایک شخص نے میری یہ باتیں سنیں تو کہا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو ایسی ہی باتیں کہتا ہے، چنانچہ میں مکہ آیا، رسول اللہ ﷺ سے مل کر آپؐ کی تعلیمات دریافت کیں اور آپؐ کی رسالت پر ایمان لے آیا''، (مودودی، سیرت، ۲/۷۱-۷۲ بحوالہ الاستیعاب، ۲/۴۳۱) ابن سعد نے ان کے تذکرہ میں ان کی حنیفیت کے تعلق سے یہی باتیں لکھی ہیں: ''...... انی کنت فی الجاهلية اری الناس علی ضلالة ولا اری الاوثان بشئی ...... رَغِبْتُ عن آلهة قومی فی

☆ ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

الجاھلیة و ذلک انھا باطل ...... فرأیت انه اله باطل لا ینفع و یضر ...... ''ان کے آخری جملہ کے پیچھے ایک خوبصورت پس منظر ہے، بت پرستوں کا حال بتاتے ہیں کہ ایک شخص اپنے علاقہ / قوم میں جاتا جہاں ان کا خدا نہ ہوتا تو وہ چار پتھر لاتا، تین تو چولھے کے لیے استعمال کرتا اور چوتھے کو خدا بنالیتا اور اس سے بہتر پتھر ملتا تو اس کو ''الہ'' بنالیتا اور جب سفر کرتا تو انہیں چھوڑ جاتا تھا۔ میری سمجھ میں آیا کہ یہ تو معبودان باطل ہیں۔ (ابن سعد، ۲۱۴/۴-۲۱۹) اور یس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، دیوبند غیر مورخہ، ۱۶۹/۱-۱۷۰ بحوالہ اصابہ، ۶/۳، ۷۶/۱، و معجم طبرانی و دلائل ابی نعیم، نیز مسند احمد و صحیح مسلم بابت حدیث نبوی۔

بنوغفار رکنانہ قبیلہ کنانہ قریش مکہ کا حلیف بھی تھا اور قریبی عزیز بھی، وہ بہت بڑا قبیلہ تھا اور اس کی متعدد شاخیں تھیں، ان میں غفار اور اسلم کے دو قبیلے بھی تھے جو پڑوسی تھے اور مکہ مکرمہ کے قریب کے علاقے میں رہتے تھے، دراصل ان کا قبائلی تعلق نہ تھا کہ اسلم قبیلہ خزاعہ کا ایک بطن تھا اور غفار کنانہ کا، لیکن دونوں کا جوار و پڑوس کا تعلق تھا لہٰذا وہ ایک ہی سمجھے جاتے تھے، ان کا علاقہ شامی شاہ راہ تجارت کے قریب تھا، ان کے افراد و طبقات دونوں کا مکہ اور مدینہ سے بہت گہرا تعلق تھا جو سیاسی بھی تھا اور سماجی بھی۔ (عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت، باب دوم، ۱۲۶-۱۲۸ اور ۱۳۱ اور ان کے حواشی)

حضرت ابوذر غفاری مشہور قدیم ترین صحابی ہیں، وہ زمانہ جاہلیت ہی میں رواجی دین سے بیزار ہوگئے تھے، رسول اکرم ﷺ سے ملاقات و قبول اسلام سے تین سال قبل وہ بتوں کی پوجا چھوڑ چکے تھے اور اللہ کے لیے نماز پڑھنے لگے تھے، نماز جس طرح چاہتے پڑھتے اور جدھر اللہ رخ کردیتا ادھر منہ کرلیتے، رات بھر نمازیں پڑھتے تا آنکہ صبح ہوجاتی، اسی زمانہ میں ان کے بھائی انیس ضرورت سے مکہ گئے تو واپس آکر حضرت ابوذر غفاریؓ کو خبر دی کہ مکہ میں ایسے شخص سے ملا جو تمہارے دین پر ہے اور اس کا خیال ہے کہ اللہ نے اسے رسول بنا کر بھیجا ہے......

"...... وقد صلیت یابن اخی قبل ان القی رسول اللہ ﷺ ثلاث سنین، فقلت: لمن؟ قال: للہ، فقلت: این توجه؟ قال: اتوجه حیث یوجھنی اللہ، اصلی عشاء حتی اذا کان من آخر السحر القیت کأنی خفاء ...... قال (انیس) انی لقیت رجلا بمکة علی دینک یزعم أننی اللہ ارسله ...... ''(ابن سعد، ۲۱۹/۴-۲۲۰ و مابعد، مودودی، سیرت، ۷۰/۲) اس روایت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری کے ایک بھتیجے بھی حنیف تھے جو ان کے ساتھ شریک نماز رہتے تھے اور غالباً ان کے بھائی انیس بھی کیوں کہ وہ بھی اسلام کی طرف سبقت کرنے والوں میں تھے اور بعض کے نزدیک پہلے اسلام لائے تھے، (اصابہ تراجم انیس و ابوذر غفاری، بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام ابی ذر الغفاریؓ، فتح الباری، ۲۱۷/۷-۲۲۱) ابن حجر نے صحیح مسلم کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قوم غفار شہر حرام کی رعایت کرتی اور عمرہ کرتی تھی'' ...... خرجنا من قومنا غفار و کانوا یحلون الشھر الحرام ......'' اس روایت میں ان کے نماز پڑھنے کا حوالہ ابن سعد کی مانند ہے اگرچہ بعض الفاظ میں فرق ہے اور حضرت انیس کا جملہ بھی: '' لقیت رجلا بمکة علی دینک ......'' حضرت عبادہ بن صامت کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر کو رات میں طواف کرتے دیکھا تو حضرت ابوذر غفاری نے آپ کو سلام اسلام کیا اور وہ اس باب میں اولین تھے:'' ...... قلت: السلام علیک یا رسول اللہ ورحمة اللہ وبرکاته، قال: فکنت اول من حیاہ بالسلام ......

دوسرے قبائلی احناف سید مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں جن سولہ حنفاء کی فہرست دی ہے وہ غالباً ڈاکٹر جواد علی کی کتاب مذکورہ '' تاریخ العرب قبل الاسلام'' سے ماخوذ ہے اور ان دونوں کی اصل محمود شکری آلوسی کی تصنیف ''بلوغ الارب'' ۲۴۴/۲ و مابعد ہے، (بلوغ الارب فی معرفة احوال العرب، مصر ۱۳۴۲ھ، بتحقیق محمد بہجۃ الاثری، ۲۴۴/۲)، سید مودودیؒ نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا، دونوں میں زیادہ تر نام مشترک ہیں اور تفصیلات بھی دونوں میں نہیں پائی جاتی ہیں، بایں ہمہ بعض ناموں میں اختلاف قرأت پایا جاتا ہے، املاء کا فرق کاتب کی کارستانی بھی ہوسکتی ہے جو خاصی پکی روایت ہے اور مصنف گرامی کا تسامح بھی۔

جو نام مختلف ہیں ان میں سوید بن عامر المصطلقی کا نام بھی ہے، سید مودودی نے سوید بن عمرو المصطلقی لکھا ہے، اسی طرح عمیر بن جندب الجہنی کو بھی عمرو بن جندب بنا دیا گیا ہے۔ عامر بن الضرب العدوانی کے والد کو الظرب (ظ سے) لکھا گیا ہے، سید مودودیؒ نے اس فہرست حنفاء سے ارباب بن رئاب اور کعب بن لوئی بن غالب کے نام ساقط کر دیے ہیں، جواد علی کی فہرست احناف کے آخر میں "آخرون" (وغیرہ) کا اضافہ بھی ہے جو بہر حال موجود و مذکور ہے۔

اس فہرست حنفاء سے بہر حال یہ پتا چلتا ہے کہ مختلف بدوی قبایل میں ایک یا ایک سے زیادہ موحدین موجود تھے، ان میں مشہور ترین کا مفصل ذکر اوپر آچکا ہے، دوسرے غیر معروف یا کم مشہور حنفاء کا تعلق جن قبایل سے تھا، یہ ہیں: بنو المصطلق رخزاعہ، جہینہ، بنو عدی، اسلم رخزی، بنو تمیم، بنو کنانہ، بنو عبس، بنو قضاعہ وغیرہ۔

سوید بن عامر مصطلقی کے اشعار رسول اکرم ﷺ نے بہ روایت "امالی سید مرتضیٰ" پڑھے تھے اور فرمایا تھا کہ وہ اگر مجھ سے ملتے تو اسلام لے آتے کیوں کہ ان کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ حنیفیت اور ملتِ ابراہیمیہ کی طرف مایل تھے، (بلوغ الارب ۲۵۹/۲ بحوالہ سید مرتضیٰ، امالی)۔

عمیر بن جندب الجہنی عہد جاہلی میں ان لوگوں میں شمار ہوتے تھے جو اللہ کی توحید کے قایل تھے اور اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے تھے، اسلام سے کچھ پہلے ان کا انتقال ہوا، اس کے بارے میں صاحب قاموس نے عجیب قصہ لکھا ہے، (بلوغ الارب ۲۶۱/۲-۲۶۲ بحوالہ صاحب القاموس)۔

عدی بن زید عبادی کا قبیلہ بنو تمیم تھا جو قبایلِ پراگندہ کا ایک عظیم ترین قبیلہ تھا اور شمال مشرقی علاقہ میں خاص سکونت رکھتا تھا، اگرچہ اس کی شاخیں مختلف علاقوں میں بکھری ہوئی تھیں اور ان کے طبقات متعدد شہروں میں موجود تھے، (عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت، باب دوم، مختلف صفحات متعلقہ)۔

عدی شعرائے جاہلیت میں فصیح سمجھے جاتے تھے، وہ خاندانی لحاظ سے نصرانی تھے، ان کے سگے دادا ایوب تھے جو عرب میں اس نام سے موسوم ہونے والوں میں اولین جانے جاتے تھے،

ان کے شاہانِ حیرہ سے بہت گہرے تعلقات و روابط تھے، خود عدی بن زید دیوانِ کسریٰ سے وابستہ تھے اور اولین کاتب تھے جس نے وہاں عربی زبان استعمال کی، ان کا رجحان بھی دھیرے دھیرے حنیفیت کی طرف ہو گیا تھا، اگرچہ اس پر شک وشبہ کا اظہار کیا گیا ہے، (بلوغ الارب ۲۶۴/۲-۲۶۵)۔

سیف بن عدی یزن والی و شاہِ یمن کا ذکر بھی آلوسی نے اصحاب دین میں کیا ہے، بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی ولادت شریفہ کے چند سال بعد آپ کی بعثت کی بشارت آپ کے دادا عبدالمطلب کو دی تھی جب وہ اکابر قریش کے ساتھ ان کو غیر عربوں (اہلِ حبشہ) پر فتح حاصل کرنے اور یمن میں عرب حکومت قایم کرنے کی مبارک باد دینے گئے تھے، ان کو صاحبِ علم و وجدان اور اہلِ مجد و شرف شمار کیا گیا ہے، وہ غالباً قدیم کتبِ سماویہ کے عالم بھی تھے، (بلوغ الارب، ۲۶۶/۲-۲۶۹ بحوالہ ماوردی، اعلام النبوۃ، الاغانی، ۲۹/۲)۔

عامر بن الظرب العدوانی کے نام کے اسی املا کے ساتھ آلوسی نے ان کا ذکر کیا ہے، ان کو عرب کے حکما و خطبا میں شمار کیا ہے، ان کی ایک طویل وصیت سے ان کے افکار نقل کیے ہیں، اس میں موت، حیات، بعد موت، خالقِ سماوات ارض وغیرہ کا ذکر ہے، ان کی حنفیت کے لحاظ سے ان کا ذکر یہاں مختصر ہے، زیادہ احوال و معلومات باب الحکما والخطبا میں دیے ہیں، (بلوغ الارب، ۲۷۵/۲-۲۷۶، نیز متعلقہ باب)۔

عبد الطانجہ بن ثعلب بن وبرہ بن قضاعہ خالق عز و جل اور تخلیق آدمؑ پر ایمان رکھتے تھے، اس باب میں ان کے پانچ اشعار بھی آلوسی نے نقل کیے ہیں، ان میں رب، قدیم اول، ماجد وغیرہ کی صفاتِ الوہی کا ذکر ہے، دعا و استعانت کا، حمد و خیر و فیض و سخاوت ربانی کا، دوسری زندگی اور اس کو عطا کرنے والے رب کا......

ادعوك يا رب بما انت اهله ۔۔۔ دعاء غريق قد تشبث بالعُصَم
لانك اهل الحمد و الخير كله ۔۔۔ وذو الطول لم تعجل بسخط ولم تلم
وانت الذى يحيه الدهر ثانيا ۔۔۔ ولم ير عبدٌ منك فى صالح وجم
وانت القديم الاول الماجد الذى ۔۔۔ تبدأت خلق الناس فى اكتم العدام

وانت الذی احللتنی غیب ظلمة الی ظلمة فی صلب (آدم) فی ظلم

علاف بن شہاب تمیمی بھی اللہ اور یوم حساب پر ایمان رکھتے تھے، اس بارے میں ان کے خوبصورت اشعار ملتے ہیں:۔

ولقد شهدت الخصم يوم رفاعة   فأخذت منه حطة المغتال
وعلمت ان الله جاز عبده   يوم الحساب بأحسن الاعمال

المتلمس بن امیہ کنانی صحنِ کعبہ میں عربوں سے خطاب کرتے کہ "میری اطاعت کرو، ہدایت پاؤ گے"، لوگوں نے پوچھا: وہ کیسے؟ فرمایا: "تم لوگوں نے بہت سے خدا بنالیے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ اللہ اس سے راضی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ان خداؤں کا بھی رب ہے اور وہ چاہتا ہے کہ صرف اسی ایک کی عبادت کی جائے"، عربوں نے ان کی بات نہیں سنی اور خیال کیا کہ وہ بنو تمیم کے دین پر قایم ہیں۔

زہیر بن ابی سُلمیٰ ذبیانی جب بھی کانٹے دار جھاڑی کے قریب سے گذرتے تو فرماتے کہ اگر عرب مجھے برا بھلا نہ کہتے تو اس بات پر میں ایمان لے آتا کہ جو ذات تجھے سوکھنے کے بعد زندہ کر دیتی ہے وہ ہڈیوں کے گلنے کے بعد بھی ان کو زندہ کر دے گی، ان کے معلقہ کے اشعار میں اللہ کے عالم الغیب ہونے اور سینوں کے راز جاننے والے اور یوم الحساب، حساب کتاب اور اللہ کی قدرت حیات وغیرہ کا ذکر ہے۔ (بلوغ الارب، ۲/۲۷۶-۲۷۸: زہیر کے لیے حوالہ زوزنی کی شرح معلقہ کا)۔

عبداللہ بن تغلب بن وبرہ بن قضاعہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے تھے اور عرب کے حکما و فضلا میں شمار ہوتے تھے، ان کے طریقہ کو دین حنیفیت کا طریقہ کہا گیا ہے، جیسے ان کے معاصرین، سابقین وغیرہ تھے، ان کے دینی افکار کا نمونہ ان کے کلام میں ملتا ہے، وہ عظیم ترین فصیح و بلیغ ترین خطبا میں تھے جس کی مثال دورِ جاہلی میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے، ان کا نام نامی ہی وحدانیت الٰہی کی ایک مثال اور ثبوت ہے، (بلوغ الارب، ۲/۲۸۰-۲۸۱)۔

عبید بن الابرص اسدی خزیمی عظیم جاہلی شاعر تھے، ابن سلام جُمحی نے "طبقات الشعرا" میں ان کو طبقہ چہارم میں رکھا ہے اور ان کو طرفہ اور علقمہ بن عبدہ کا ہم پلہ کہا ہے، ابن قتیبہ نے "کتاب الشعرا" میں بیان کیا ہے کہ ان کی عمر تین سو سال سے زیادہ ہوئی تھی، مشہور شاہِ حیرہ نعمان بن منذر

کے دادا منذر بن امری القیس سے ان کے تعلقات تھے اور ان کی ایک جنگ میں وہ مقتول ہوئے تھے، ان کے روابط دوسرے اکابرِ وقت سے بھی بہت عمدہ تھے، ان کے اشعار توحید الٰہی کے عقیدہ کا اثبات کرتے ہیں، مثلاً ایک شعر ہے:

وليفنين هذا و ذاك كلاهما   الا الاله ووجه المعبود

(بلوغ الارب، ۲/۲۸۱، نیز ملاحظہ ہو: جواد علی، مذکورہ بالا اور بحث آیندہ برعقاید احناف)۔

عقاید و اعمالِ احناف

عہد جاہلی کے احناف و حنفا کے عقاید و اعمال اور ان کے دین کے بارے میں ہماری معلومات تقریباً صفر ہیں، کتب سیرت و تاریخ و تذکرہ میں جو کچھ اس مسئلہ پر مذکور ملتا ہے وہ خاصا مبہم، مختصر اور مشتبہ اشارات کی شکل میں ہے، صرف یہ واضح طور سے بیان ضرور ملتا ہے کہ روایتی دین عرب کے خلاف تھے اور دین ابراہیمی کی جستجو میں لگ گئے تھے، جاہلی دین عرب کے مسئلہ پر بھی ہماری معلومات بہت ناقص و محدود ہیں اور دین ابراہیمی سے متعلق ابہام شدید تر ہے، بہرکیف جو شخص بھی موحد یا حنیف بتایا جاتا ہے اس کے بارے میں یہ صراحت ضرور ملتی ہے کہ وہ عربوں کی بت پرستی کے خلاف تھا، دستیاب معلومات و اشارات کی بنا پر ان کے عقاید و اعمال اور دینی اشغال کے بارے میں ذیل میں چند نکات لکھے جاتے ہیں:

۱- توحید: یہ تقریباً تمام احناف کا اعتراف ملتا ہے کہ وہ مختلف و متعدد قبائلی اور علاقائی دیوی دیوتاؤں اور خداؤں کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور صرف ایک "الٰہ واحد" کا عقیدہ رکھتے تھے جو ابراہیم کا رب ہے اور اسی کے ساتھ رب العالمین ہے، اسی "الٰہ واحد" کو وہ قابلِ عبادت سمجھتے تھے اور واضح طریقِ ابراہیمی نہ جاننے کے سبب جس طرح سمجھتے اس کی عبادت کرتے تھے، جواد علی نے مستشرقین کے اس خیالِ خام پر تنقید کی ہے کہ توحید الٰہی کا تصور احناف میں یہودیت و نصرانیت کے اثراتِ دین سے آیا تھا، ان کے دلایل بہت منطقی اور مؤثر اور حقیقی و تاریخی ہیں، اول یہ کہ توحید الٰہی کا تصور یہودی اور نصرانی قبایل و طبقات میں غیر واضح بلکہ مفقود تھا، وہ تثلیث و ابنیت کے عقیدوں کو مانتے تھے، دوم یہ کہ بنو اسرائیل کا خاص خدا تھا جو رب کائنات نہ تھا، بلکہ صرف ایک خاص قوم اور مجموعۂ قبایل کا ہی خدا اور رب تھا، سوم عربوں میں خواہ وہ بت پرست ہوں یا موحد و حنیف کسی ایک قومی خدا کا تصور و عقیدہ نہ تھا جس کو سب مانتے ہوں جب کہ عربوں کے تصور الٰہ

اور احناف کے عقیدۂ الٰہ واحد میں رب کائنات اور تمام انسانوں کے رب ہونے کا عقیدہ موجود ہے، قرآن مجید کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو بت پرستی سے متنفر ہوگئے تھے توحید خالص کا دین رکھتے تھے جو دین یہود و نصاریٰ سے بلند و بالا اور اعلیٰ و افضل تھا کیوں کہ وہ حضرت ابراہیم کی مانند یہودی تھے اور نہ نصرانی اور نہ مشرک بلکہ حنیف مسلم تھے، ان کے امام و رسول اور مقتدا حضرت ابراہیم تھے جن کے عقیدۂ توحید کی تصریح متعدد آیات قرآنی میں آئی ہے، (سورۂ بقرہ ۱۳۵، آل عمران ۹۵، نساء ۱۲۵، انعام ۷۹، ۱۶۱، یونس ۱۰۵، نحل ۱۲۰، ۱۲۳، روم ۳۰، حج ۳۱، بینہ ۵)۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے جاہلی عربوں کے عقاید کے بارے میں فلسفیانہ انداز سے لکھا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی بعض اصول مسلم تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور دوسری کائنات کی پیدایش میں جو بشکل جواہر تھے اللہ ہی کو خالق مانتے تھے اور بڑے بڑے معاملات دنیا کی تدبیر میں اس کے کسی شریک کے قایل نہ تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ اس کے حکم و فیصلہ کو کوئی روکنے والا نہیں ہے جب وہ فیصلہ حتمی فرمالے ...... فمن تلک الاصول القول بانه لا شریک لله تعالیٰ فی خلق السماوات والارض وما فیها من الجواهر ولا شریک له فی تدبیر الامور العظام، وانه لا راد لحکمه ولا مانع لقضائه اذا ابرم و جزم...... (حجة الله البالغه، ۱/۱۲۴)۔

احناف کے الٰہ واحد کے لیے ''اللہ'' کا اسم ذات ان سے متعلق روایات و اخبار میں بھی ملتا ہے اور عام عربوں کے عقیدہ میں بھی، عرب کی جاہلی شاعری میں اس کی غیر مبہم اور موکد صراحت ملتی ہے کہ ان کے الٰہ واحد کا نام اللہ ہے، قرآن مجید کی مختلف آیات کریمہ میں بھی ان کے عقیدہ اللہ خالق کائنات اور رب کونین کا ناقابل تردید ثبوت ملتا ہے، (مثلاً زمر ۳۸: وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ، سورہ زخرف ۸۷: وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ وغیرہ)، مستشرقین کی یہ تحقیقی کاوش سعی خام سے کم نہیں کہ اللہ کا لفظ و تصور و عقیدہ یہود و نصاریٰ سے آیا تھا کیوں کہ وہ ان کے نہ ماضی میں موجود تھا اور نہ حال میں پایا جاتا ہے، اگر وہ پایا جاتا بھی ہے تو دین ابراہیمی کے ایک عطیہ و تحفہ کے بطور،

دوسرا لفظ ''الٰہ واحد'' کے لیے ''رحمٰن'' بھی عرب جاہلی شاعری، تاریخی روایات اور قرآنی آیات سے ان کے ہاں موجود ہونے کا ثبوت رکھتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ رحمٰن کے لفظ سے بعض عرب قبایل نابلد تھے یا مخالف، لیکن احناف تو قایل تھے، جنوبی عرب قبایل کے لوگ رب آسمان (ذسموی) اور الرحمٰن کی عبادت کرتے تھے جو توحید الٰہی اور الٰہ واحد کا واضح اظہار ہے، الٰہ واحد، اللہ اور رحمٰن کا باقاعدہ ثبوت آثار قدیمہ سے بھی ملتا ہے، جنوبی یمن کے بعض نو دریافت شدہ کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے عرب قبایل، طبقات و افراد اپنے الٰہ واحد کو اسی نام سے پکارا کرتے تھے اور اسی سے استعانت کرتے تھے، (جواد علی، ۶/۲۹۵ و مابعد، بخیل رحمٰن ای بخیل الرحمٰن ای بقوة الرحمٰن، ای استعین بقدرته وبقوته، مودودی مذکورہ بالا)۔

امیہ بن ابی الصلت ثقفی کی طرف منسوب ایک شعر میں حنیفیت، اللہ اور دین کا تصور موجود ہے اور اس سے بڑھ کر یہ اظہار حقیقت کہ دین حنیفیت کے سوا سارے دین اللہ جل جلالہ کے نزدیک باطل و جھوٹ ہیں:۔

کل دین یوم القیامة عند الله الا دین الحنیفیة زور

(جواد علی، ۶/۲۹۴ بحوالہ الاغانی، دارالکتب المصریہ طبع، ۴/۱۲۲، حجة الله البالغه، ۱/ ۲۷۷ و مابعد)،

ابن اثیر نے نابغہ جعدی کا ایک شعر نقل کیا ہے:

الحمد لله لا شریک له   من لم یقلها فنفسه ظلما (اسد الغابه، ۳/۵)۔

مشہور عرب جاہلی شاعر امرؤ القیس بن حجر کندی کے اشعار میں اللہ اور توحید کا تصور ملتا ہے اس لیے بعض اہل قلم نے ان کو بھی احناف عہد میں شمار کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے تو ان کے اوپر ایک پوری فصل باندھی ہے اور بعض دوسروں نے بھی، ان کے بعض اشعار ہیں:۔

فقالت یمین الله ما لک حیلة   وما ان اری عنک الغواية تنجلی
فالیوم اسقی غیر مستحقب   اثما من الله ولا واغل
لله زبدان امسی قرقرا جلدا   وکان من جندل اصم منضودا
اری ابلی والحمد لله اصبحت   ثقالا اذا ما استقلتها صعودها

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ امرؤ القیس ایک مرد مومن و مسلم تھا، جو اللہ واحد کا عقیدہ رکھتا تھا اور ثواب و عتاب پر ایمان رکھتا تھا، وہ اللہ سے ڈرتا تھا اور گناہ و فسق سے بچتا تھا، اخباریوں نے اس کے بارے میں فاسقانہ روایات کا ڈھیر یونہی لگا دیا ہے جن پر بھروسہ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کیوں کہ ان کی حیثیت افسانوی زیادہ معلوم ہوتی ہے تاریخی و واقعی کم، (جواد علی،۶/۲۹۷-۲۹۸)۔

ڈاکٹر جواد علی نے اسی طرح ایک اور جاہلی شاعر عبید بن الابرص اسدی خزیمی کے اشعار نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ اگر ان کی نسبت شاعر موصوف کی طرف صحیح ہے تو وہ بھی شاعر موحد، مومن و مسلم اور حنیف تھے:۔

من یسال الناس یحرموہ   و سائل اللہ لا یخیب
باللہ یدرک کل خیر   والقول فی بعضہ تلغیب
واللہ لیس لہ شریک   علام ما اخفت القلوب

ان کا ایک اور شعر یہ ہے:۔

حلفت باللہ ان اللہ ذو نعم   لمن یشاء و ذو عفو و تصفاح

اسی طرح طفیل بن عوف غنوی کے اشعار میں اللہ کا ذکر اور اس کی قسم کھانے کا حوالہ پایا جاتا ہے، حارث بن حلزہ یشکری کے معلقہ میں امر اللہ بلغ تشقی به الاشقیاء اور ''ان اللہ عالم بالامور'' (بلاشبہ اللہ تمام چیزوں کا جاننے والا ہے) کی تصریح ملتی ہے، ان کے دوسرے اشعار میں بھی الہ واحد کا ذکر ہے۔

شاعر متلمس کنانی اپنے اشعار میں اللہ کی قسم کھاتا ہے اور مختلف جملوں میں اللہ کا ذکر کرتا ہے جیسے ''ابی اللہ'' ''للہ اری'' ''تقوی اللہ'' ''عاداک اللہ'' وغیرہ، اسی طرح زہیر بن ابی سلمی کے اشعار میں اللہ واحد علام کا ذکر موجود ہے، (جواد علی ۶ ۲۹۹-۳۰۲ بحوالہ الاغانی،۶/۹۱، المعلقات العشر و اخبار شعرانہا،۶۲، شعراء النصرانیۃ،۱۹، دواوین شعراء عبید، زہیر، المتلمس وغیرہ، جمهرۃ اشعار العرب،۴۴، ۲۰۶ وغیرہ)۔

۲- نبوت و رسالت: جاہلی عربوں میں حتی کہ بت پرستوں میں بھی نبوت و رسالت کا تصور و عقیدہ موجود تھا خواہ کتنا ہی مبہم ہو، یہ اعتراف کہ وہ دین ابراہیمی کے ماننے والے ہیں اور ان کے جد امجد حضرت اسماعیل تھے ان کے عقیدۂ رسالت کو ثابت کرتا ہے، ان کے دیگر اعترافات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ دین ابراہیمی یا حنیفیت کو اللہ کا دین سمجھتے تھے جو اس رب کائنات نے انسانوں کی بہبود کے لیے اپنے رسول مکرم حضرات ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے واسطہ سے دنیا میں بھیجا تھا، وہ دوسرے انبیائے کرام سے بھی واقف تھے، یہ دعوی کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی موجودگی کے سبب اس الوہی ارادہ سے آگاہ ہوئے تھے محض خام خیالی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی مبہم معلومات کو ان لوگوں نے کچھ صاف کر دیا تھا، کیوں کہ خود یہودی و نصرانی طبقات میں نبوت و رسالت کا عقیدہ انحرافات و خرافات کی بنا پر خراب ہو چکا تھا، احناف کا تصور رسالت ان کے تصور دین حنیف اور ملت ابراہیمی سے وابستگی سے ہوا تھا، شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے کہ عہد نبوی میں اہل جاہلیت بعثت انبیا کو تسلیم کرتے تھے......

وکان اهل الجاهلية فی زمان النبی ﷺ یسلمون جواز بعثة الانبياء.....
(حجة الله البالغه،۱/۲۷۳)۔

بالعموم قدیم و جدید سیرت نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ اہل کتاب علما (یہودی احبار اور نصرانی راہبوں) کی بنا پر عربوں اور احناف کو ایک نبی آخر الزماں کے مبعوث ہونے کا علم ہوا تھا کیوں کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں کے مطابق ان کی آمد کی پیش گوئیاں کرتے رہتے تھے، شام، عراق، مدینہ/یثرب، یمن اور بعض دوسرے علاقوں کے یہودی اور نصرانی اہل علم کی پیش گوئیوں کا ذکر حضرات زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل، سلمان فارسی وغیرہ احناف کے علاوہ عام باشندگان اوس و خزرج کے حوالے سے ملتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ بعثتِ نبوی کے متعلق مدتوں سے یہ خیال عربوں میں پیدا ہو چلا تھا کہ ایک آخری نبی مکرم کی بعثت بنو اسماعیل میں ہوگی، رسول اکرم ﷺ کے جد امجد کعب بن لوئی کے متعلق روایت کہتی ہے کہ وہ بھی نبی آخر الزماں کی بعثت کے قائل تھے اور یمن کے ابو اسعد حمیری بھی، دیگر اجداد نبوی کے بارے میں روایات یہی بتاتی ہیں، امیہ بن ابی الصلت ثقفی اور بعض دوسرے شعرا جاہلی کلام میں بھی اس کے مسلسل حوالے آتے ہیں اور

ان کی بعض صفات کے بھی، اگر یہ روایات صحیح ہیں تو نبوت و رسالت کے تسلسل و ختم کا بھی مبہم حوالہ ملتا ہے۔

۳- آخرت و معاد: شاہ ولی اللہ دہلوی نے اہل جاہلیت کے باب میں وضاحت کی ہے کہ وہ اعمال کی جزا و سزا کے قایل تھے، نیکی کے اصول و اقسام کا اعتقاد رکھتے تھے اور ارتفاقات دوم وسوم پر عمل کیا کرتے تھے ...... ویقولون بالمجازاة ویعتقدون اصول انواع البر ویتعاملون بالارتفاقات الثانی والثالث ...... (حجة الله البالغه، ۱/۲۷۳، نیز: ۱/۲۷۴-۲۷۵)۔

احناف کے متعدد شعرا اور خطبا اور اہل فکر کی علمی کاوشوں سے اور ان سے متعلق روایات واخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کم از کم باشعور طبقہ میں آخرت و معاد، قیامت، حساب کتاب اور جنت وجہنم اور ان سے وابستہ تصورات وعقاید کا اشارہ ملتا ہے، اگرچہ یہ عقاید و تصورات دھندلے تھے اور ان کی سمت واضح نہ تھی، امیہ کے مذکورہ بالا شعر میں یوم القیامۃ کا لفظ موجود ہے، قس بن ساعدہ ایادی کی طرف منسوب خطبہ رخطبات میں حشر ونشر، بعث بعد الموت، حساب کتاب اور جنت وجہنم کا واضح ذکر ملتا ہے اور اجر وثواب وسزا وعقاب کا بھی، کعب بن لوئی موت اور اس کی ہولناکیوں سے ڈراتے تھے اور یوم موعود ویوم آخرت اور اس کے احوال یاد دلاتے تھے۔

امیہ بن ابی الصلت ثقفی کے بارے میں ابن کثیر کی نقل کردہ روایت گذر چکی ہے، جس کے مطابق وہ ایمان رکھتے تھے کہ ہم ضرور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ہم سے ضرور حساب لیا جائے گا اور پھر ایک گروہ جنت میں جائے گا اور دوسرا جہنم میں، مشہور شاعر نابغہ جعدی کے کلام میں مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور اعمال کے مطابق جزا وسزا اور جنت وجہنم ملنے کا ذکر واضح ہے، عامر بن الظرب العدوانی کے افکار حنیفیت میں حیات بعد موت اور جزا وسزا کا حوالہ آیا ہے، وہ قیامت وآخرت کے قایل تھے، عبد الطابخہ بن ثعلب قضاعی کے ایک شعر میں یہ اعتراف ملتا ہے کہ اللہ ہی زمانے کو دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے گا، ان ہی کی طرح ایک دوسرے حنیف علاف بن شہاب تمیمی یوم حساب پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ بہترین اعمال کا

بہترین بدلہ عطا کرے گا، زہیر بن ابی سلمی ذبیانی کانٹوں کے سوکھنے کے بعد دوبارہ ہرے ہونے سے انسانوں کی ہڈیوں کے گل جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہوجانے کے قایل ہوگئے تھے اور مشاہدات دنیا اور واقعات کائنات سے یوم حساب اور حیات بعد موت پر دلیل لاتے تھے، حضرت لبید بن ربیعہ عامری کے اشعار میں آخرت ومعاد، حساب کتاب اور جزا وسزا وغیرہ کا ذکر متعدد جگہ ملتا ہے، ان کے علاوہ بھی بہت سے شعرائے احناف کے ہاں آخرت کا تصور ملتا ہے خواہ وہ کتنا ہی غیر واضح اور مبہم ہو، اہل جاہلیت کے عقاید دیگر - ملائکہ، قدر رتقدیر، ملاء اعلیٰ، حاملین عرش، جنت ودوزخ وغیرہ کے بارے میں حجۃ اللہ البالغہ کی مذکورہ فصل میں بہت عمدہ حکیمانہ بحث ملتی ہے (۱/۲۷۳-۲۷۵ ومابعد)۔

اعمال واشغال

دین حنیفی اور ملت ابراہیمی میں اسلام کے کئی اعمال، ارکان اور اشغال پائے جاتے تھے اور ان میں سے بعض احناف وموحدین میں زیادہ واضح طور سے زیر عمل تھے اور مشرکین عرب بھی ان پر عامل تھے، ان اعمال واشغال دینی کی تصویر ان کے عقاید وافکار کی مانند مبہم تھی کہ ان کا دین اصلی ہی دھندلا گیا تھا، البتہ بعض اعمال وارکان نہ صرف روشن تھے بلکہ تقریباً سارے عربوں میں رایج بھی تھے، ان کو قومی دین کا عمل کہا جاسکتا ہے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے اسی کو ان کے عقیدہ حلال وحرام سے تعبیر کیا ہے: انه كلف العباد بما شاء فاحل وحرم وانه مجاز على الاعمال (۱/۲۷۵)، یہ دوسری بات ہے کہ امتداد زمانہ سے اور مدتوں سے نبوی ہدایت سے محرومی کے سبب ان میں بھی خرافات شامل ہوگئی تھیں، بعض جدید اہل قلم اور کئی مستند قدیم اہل فکر نے اعمال احناف اور روایات عرب کا صحیح تجزیہ نہیں کیا ہے اور اس کی وجہ وہی ایک رائے کی کورانہ تقلید اور تمام واقعات وروایات کے تجزیہ کی کمی ہے، ذیل میں ان احناف جاہلیت کے اعمال کا مختصر جایزہ مذکورہ بالا روایات وحقایق کے پس منظر میں پیش کیا جارہا ہے، اس کے ضمن میں مشرکین کی دینی روایات کا تجزیہ بھی آتا رہے گا کہ بسا اوقات وہ مشترکہ میراث کا مطالعہ بن جاتا ہے۔

مگر سب سے پہلے دین حنیف کے اعمال کے بارے میں بعض اصحاب فکر کی آراء وخیالات کا تجزیہ ضروری ہے، اخفش کا قول گذر چکا ہے کہ عہد جاہلی عرب میں دین ابراہیمی کے اعمال

میں سے صرف حج بیت اللہ اور ختنہ باقی رہ گیا تھا باقی کچھ نہ بچا تھا، جوان دونوں پر عمل کرتا وہ حنیف سمجھا جاتا، مقالہ "حنیف" کے مقالہ نگار نے الزجاجی کے قول میں ان دو کے علاوہ غسل جنابت کے عمل کو بھی دین حنیف کا ایک رکن بتایا ہے، ان اقوال کے نقل کرنے والوں نے بالعموم ان کے قائلین پر نقد نہیں کیا ہے اور ان کے "آدھے سچ" کو پورا سچ مان کر قبول کرلیا ہے، حالاں کہ مختلف اقوال کے اضافے ہی ان کی جزئی صحت کا اعلان کرتے ہیں، تقریباً تمام قدیم روایات اور تمام اقوال میں یہ بھی آتا ہے کہ دین حنیف میں بت پرستی کی گنجائش نہ تھی، اخفش وزجاجی کے اقوال میں ان کا حوالہ نہیں آیا، یہی دوسرے جزئی اعمال بیان کرنے والی آراء کا حال ہے، لہذا یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اعمالِ احناف وارکان دینِ حنفی کا تجزیہ صحیح اور کامل طور سے نہیں کرتے، جو اب پیش ہے، (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، جواد علی، ۲۹۰/۶ اور ان کے حواشی وحوالے مذکورہ بالا)۔

عبادات اگرچہ روزانہ اور زیادہ معمول کی عبادات واعمال کا حوالہ بھی احناف ودین حنفی سے متعلق روایات میں آیا ہے لیکن ان کا حوالہ کم کم آیا ہے اور خاصا مبہم بھی ہے، لہذا ان کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا حالاں کہ اسلامی فکر میں ان کو اولیت حاصل ہے:۔

۱- حج وعمرہ: ان میں سے اول الذکر سالانہ عبادت ہے اور عمرہ وطواف بھی وقت طلب تھی بالخصوص مکہ سے باہر کے باشندوں کے لیے، یہ عجیب بات ہے کہ مشرکین عرب میں یہ عبادت ہمیشہ جاری رہی اور اس میں حضرت ابراہیم کی اذان کے بعد سے کبھی انقطاع نہیں آیا اور نہ صرف اہل مکہ اور باشندگانِ حرم نے اس کو پوری طرح باقی رکھا بلکہ تمام عرب قبایل نے بھی اس میں پوری آب وتاب، ایمانی جوش وجذبے اور قومی ولولے اور دینی صلابت کے ساتھ حصہ لیا، عہد جاہلی میں حج کا موضوع ایک الگ تحقیقی مقالے کا متقاضی ہے، جس کو انشاء اللہ جلد ہی پیش کیا جائے گا، سردست دین احناف کے حوالے سے اس کے بارے میں چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱- حج: احناف ومشرکین عرب دونوں کی دینی عبادت تھی اور وہ برابر ہر سال اسے ادا کیا کرتے تھے، تمام عرب اور اسلامی مصادر کا اتفاق ہے کہ قریش مکہ کی قیادت میں اور ان سے قبل دوسرے حکام مکہ مکرمہ کی رہنمائی میں حج کا سالانہ فریضہ ادا کیا جاتا رہا، اس میں تمام قبایل عرب

کے لوگ ہر چہار سمت سے آکر شرکت کیا کرتے تھے، ابن سعد کا بیان ہے کہ عمالیق سے قبل بنو جرہم حج کے مناسک ادا کرتے تھے اور اہتمام وانتظام بھی کرتے تھے (۴۸/۱)، کعب بن لوئی کا حوالہ گذر چکا کہ وہ حج کے لیے لوگوں کو نہ صرف اہتمام کرنے کے لیے کہتے تھے بلکہ بعض خرافات سے بچنے کی تاکید کرتے، قصی بن کلاب اپنے وطن مکہ واپس آئے تو اپنے شامی سرحد کے عزیزوں قضاعہ اور عذرہ کے حجاج کے قافلہ میں اور کچھ مدت کے بعد ان کی مدد کے لیے ان کے عذری رشتہ داروں کا قافلہ آیا تھا، وہ حجاج کا کارواں لے کر آیا تھا، اس سے اہم بات یہ ہے کہ بانی شرک و بت پرستی عمرو بن لحی خزاعی حجاج کی خدمات انجام دیتا اور حج کے مناسک ادا کراتا تھا، (برہان الدین علی حلبی، السیرۃ الحلبیۃ، دار الاحیاء التراث العربی، ۱/۷-۱۲ ومابعد) دراصل اقامت حج در عہد جاہلی پر حوالوں اور شہادتوں کی ضرورت ہے ہی نہیں اور اگر ضرورت ہے تو اس کی کہ جاہلی عہد میں حج نہیں کیا کرتے تھے اور ایسی کوئی شہادت تو کجا، شبہ بھی نہیں مل سکتا، (حجۃ اللہ البالغہ، ۲۷۹/۱)۔

حج کے سلسلہ میں یہ بھی ایک اہم حقیقت ہے کہ اس کے تمام مناسک، ارکان اور اعمال ہمیشہ باقی رہے، احرام، تلبیہ، طواف، منیٰ کا قیام، مزدلفہ کی شب گذاری، عرفات کا وقوف، قربانی وذبیحہ، طواف وداع اور دوسرے تمام سننِ ابراہیمی، ان میں سے کوئی ترک نہیں کیا گیا، ہاں بعض خرافات بعض عربوں نے شروع کردی تھیں جیسے حمس عرب (قریش وکنانہ) اپنے اہل حرم ہونے کے زعم میں یا تو اپنے خاص کپڑوں میں طواف بیت اللہ کرتے اور کراتے تھے یا خود بھی برہنہ طواف کرتے تھے اور دوسرے عرب مردوں کو برہنہ ہی طواف کرنے پر مجبور کرتے تھے یا قریش وکنانہ (حمس) وقوفِ عرفہ کے لیے نہیں جاتے تھے اور مزدلفہ سے لوٹ آتے تھے کہ عرفات کا قیام ان کے خیال میں عوام کے لیے تھا اور خواص وخاصانِ حرم کے لیے وہ ضروری نہ تھا، (ابن ہشام)۔

عمرہ بھی تمام عربوں کا مشترکہ دینی عمل تھا، سال بھر بالخصوص مقدس مہینوں کے دوران مکی اور غیر مکی عرب قرب وجوار اور دور دراز سے عمرہ کے لیے مکہ آیا کرتے تھے، اس کے دونوں رکن طواف وسعی بھی برقرار رہے۔

طواف بیت اللہ قریشی عربوں اور مکہ میں موجود افراد و طبقات کا تقریباً روزانہ کا معمول اور ان کی دوامی عبادت تھی، تمام مشرکین مکہ و احناف کے بارے میں روایات کا اتفاق ملتا ہے کہ وہ طواف کرتے رہتے تھے، طواف کے سات اشواط (چکروں) اور حجر اسود کے سامنے سے استلام کا آغاز کر کے رکن عراقی، رکن شامی اور رکن یمانی سے ہوتے ہوئے پھر نقطۂ آغاز پر پہونچ کر چکر پورا کرنے کا باقاعدہ ذکر ہماری روایات میں ملتا ہے اور آخر میں دعا کا بھی۔

حج و عمرہ و طواف اور زیارت بیت اللہ اور خانہ کعبہ سے متعلق دوسرے اعمال جیسے غلاف کعبہ کی آرائش اور تعمیر کعبہ و مرمت عمارت وغیرہ کا حوالہ بہت سی روایات میں احناف کے حوالے سے بھی آتا ہے اور ان کا ذکر آچکا، اسعد ابوکرب حمیری حج و عمرہ کے علاوہ کعبہ پر غلاف چڑھاتے تھے، وکیع بن سلمہ ایادی بنو جرہم کے بعد خانہ کے متولی رہے، قوم غفار کے بارے میں روایت ہے کہ وہ خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے برابر آتی تھی اور ان کے حنیف ابوذر غفاری حج و عمرہ کرتے رہتے تھے اور رسول اکرم ﷺ سے ملاقات کے لیے آئے تھے تو طواف و زیارت کا فرض پہلے ادا کیا تھا اور ان کے بھائی انیس نے بھی، دراصل رسول اکرم ﷺ کے عہد میں جتنے حنفاء مکہ آئے وہ سب کے سب حج و عمرہ یا زیارت کعبہ کے لیے ہی آئے تھے جیسے سوید بن صامت، امیہ بن ابی الصلت ثقفی، نابغہ ذبیانی، ابوالہیثم بن التیہان، ذکوان بن عبد قیس اور دوسرے اہل یثرب و عرب۔

۲ و ۳ - نماز و زکوۃ: سب سے اہم عبادت اسلام میں نماز (صلوۃ) ہے اور غالباً وہ دین ابراہیمی میں بھی روزانہ عبادت رہی ہے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس کے وجود کو ثابت کیا ہے:
وکانت فیھم الصلوۃ وکان ابو ذرؓ یصلی ...... وکان قس بن ساعدہ الایادی یصلی ...... (حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۲۷۸)، دین ابراہیمی کے بقایا میں سے ایک دن کی نماز بھی تھی جو کم از کم مشرکین مکہ اور کافران قریش بھی ادا کیا کرتے تھے، روایات سیرت میں آتا ہے کہ دوپہر دن کی نماز رسول اکرم ﷺ اور دوسرے صحابہ کرام مشرکین مکہ کے ساتھ صحن کعبہ کے اندر ادا کرتے تھے اور قریش اس پر اعتراض نہیں کرتے تھے کہ وہ اس کے قائل تھے البتہ دوسری نمازوں کے اوقات کے لیے مسلمانان مکہ کو شہر کے قرب و جوار کی گھاٹیوں اور

وادیوں کی پناہ لینی پڑتی تھی کہ دشمنان اسلام معترض ہوتے تھے۔

حضرت زید بن عمرو بن نفیل عدوی کی عام عبادت کا ذکر آتا ہے اور گھٹنوں کے بل سجدہ کرنے کا کیوں کہ ان کو صحیح طریق عبادت اور پسندیدہ طرز تعبد الٰہی معلوم نہ تھا، غالباً وہ اس قریشی نماز کو ادا کیا کرتے تھے، قس بن ساعدہ ایادی اور بعض دوسرے احناف کے بارے میں بھی آتا ہے کہ وہ اپنی سمجھ کے مطابق عبادت الٰہی انجام دیتے، حضرت ابوذر غفاری اور ان کے ایک گمنام حنیف بھتیجے کے بارے میں یہ واضح بیان روایات حدیث و سیرت میں ملتا ہے کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے اور رات بھر نمازیں پڑھا کرتے تھے اور ان کا قبلۂ نماز توفیق الٰہی سے متعین ہوا کرتا تھا، ان کی نماز کے بارے میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ وہ رسول اکرمؐ سے ملاقات سے قبل یعنی بعثت نبوی سے تین سال پہلے سے نماز پڑھنے لگے تھے، ان کی نماز کی ہیئت و ساخت نہیں معلوم مگر اس سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ بعض عرب بدوی قبایل میں بھی نماز کا تصور موجود تھا اور دین حنیفی / ابراہیمی کے اس عظیم عمل پر کاربندی بھی، شاہ ولی اللہ دہلوی نے عربوں کی نماز، سجدہ کے علاوہ دعا، ذکر اور زکوۃ کو بھی عہد جاہلیت میں ثابت کیا ہے اور ان کی مہمان نوازی کا حوالہ دیا ہے" والمحفوظ من الصلوۃ فی امم الیھود والمجوس وبقیۃ العرب افعال تعظیمیۃ لا سیما السجود، واقوال من الدعاء والزکاۃ وکانت فیھم الزکاۃ وکان المعمول عندھم منھا قری الضیف والصدقۃ علی المساکین وصلۃ الارحام والاعانۃ فی نوائب الحق وکانوا یمدحون بھا ویعرفون انھا کمال الانسان وسعادتہ " (حجۃ اللہ البالغہ، ۱/۲۷۸)۔

۴ - روزہ / صوم اور تحنث: دین ابراہیمی اور دوسرے تمام ربانی ادیان یا آسمانی مذاہب میں روزہ ہمیشہ فرض رہا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں واضح بیان ہے: یا ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون (بقرہ:۱۸۳)۔

حافظ ابن کثیر نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں روایت نقل کی ہے کہ پچھلی قوموں پر صرف تین دن کا روزہ رکھنا ہر ماہ میں فرض تھا اور وہ حضرت نوحؑ کے زمانے سے تھا تا آنکہ صیام رمضان

نے اس کو منسوخ کیا یا بہ الفاظ دیگر اس کی جگہ لے لی، ...... وقد روی ان الصیام کان اولا کما کان علیه الامم قبلنا من کل شهر ثلاثة ایام عن معاذ و ابن مسعود و ابن عباس و عطاء و قتادة و الضحاك بن مزاحم و زاد لم یزل هذا مشروعا من زمان نوح الی ان نسخ الله ذلک بصیام رمضان"۔

ایک حدیث نبوی میں یہ بھی ہے کہ مسلمانوں سے قبل بعض امتوں پر رمضان کے روزے بھی فرض کیے گئے تھے:"...... قال رسول الله ﷺ: صیام رمضان کتبه الله علی الامم قبلکم ......" فی حدیث طویل۔ امام احمد بن حنبل کا ایک قول نقل کیا ہے کہ نماز اور روزہ میں تین تین احوال کی تبدیلی آئی، روزے کے تین احوال نبوی یہ تھے کہ ۱- شروع میں آپ ہر ماہ تین دنوں کے روزے رکھتے تھے، ۲- پھر عاشورا کا روزہ رکھا، ۳- پھر صیام رمضان رکھے، (تفسیر القرآن العظیم، عیسی البابی قاہرہ، غیر مطبوعہ، ۱/۲۱۳-۲۱۴، دیگر کتب تفسیر)۔

امام بخاری نے ایک حدیث حضرت عائشہؓ کی سند سے روایت کی ہے کہ عاشورا کا روزہ قریش جاہلیت میں رکھا کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ بھی جاہلی عہد میں رکھتے تھے اور مدینہ آنے کے بعد بھی اس کو خود بھی رکھا اور دوسروں کو حکم دیا کہ اس کے روزے رکھا کریں"...... کان یوم عاشورا تصومه قریش فی الجاهلیة و کان رسول الله ﷺ یصومه فی الجاهلیة فلما قدم المدینة صامه وامر بصیامه " (کتاب الصوم، باب صیام یوم عاشورا، حدیث نمبر ۲۰۰۲: فتح الباری ۴/۳۱۰-۳۱۳)، ابن حجر کی تشریح ہے کہ عاشورا کا روزہ قریش نے شاید سابقہ شریعت سے سیکھا تھا"...... واما صیام قریش لعاشورا فلعلهم تلقوه من الشرع السالف "انہوں نے بعض اور اسباب بتائے ہیں لیکن دین ابراہیمی کا ذکر نہیں کیا، بہ ظاہر "شرع سالف" سے دین ابراہیمی کے یا دین حنیفی کے اور کیا مراد ہو سکتا ہے۔

احناف میں صرف نابغہ جعدی کے متعلق ذکر ملتا ہے کہ وہ روزہ رکھا کرتے تھے، امکان ہے کہ اور دوسرے احناف بھی رکھتے ہوں گے کیوں کہ جب کفار قریش رکھ سکتے تھے تو اس دینی فرض کی ادائیگی احناف بہ طریق اول کر سکتے تھے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے عام عرب کے روزہ

رکھنے، صوم عاشورا کی پابند کرنے اور مسجد میں اعتکاف کرنے کا ذکر کیا ہے،" وکان فیهم الصوم من الفجر الی غروب الشمس و کانت قریش تصوم عاشورا فی الجاهلیة و کان الجوار فی المسجد و کان عمر نذر اعتکاف لیلة فی الجاهلیة ...... وبالجملة کان اهل الجاهلیة یتحنثون بانواع التحنثات ...... " حجة الله البالغة، ۱/۲۷۸-۲۷۹، اسد الغابه، ۵/۳: حضرت نابغہ جعدی کے روزہ کے لیے۔

اعمال احناف اور قریش کے حوالے سے اوپر تحنث کا ذکر آ چکا ہے، وہ عام عبادت الٰہی کے معنی میں آیا ہے۔

۱- تحنث در رمضان: قریش مکہ اور دوسرے احناف حرم کے ہاں ایک اور روایت یہ تھی کہ وہ پورے سال میں ایک ماہ میں حرا اور دوسرے مقامات خلوت میں پورا مہینہ عبادت و خلوت گزینی میں گزارا کرتے تھے، وہ پورے ماہ کا زاد راہ ساتھ لے جاتے یا چند دنوں کا اور اگر وہ ختم ہو جاتا تو "اہل بیت" کے پاس آتے، زاد تحنث لیتے اور پھر اپنے مقام عبادت پر جا کر عبادت، مراقبہ، غور و فکر کیا کرتے تھے، اجداد نبوی بالخصوص رسول اکرم ﷺ کے دادا جناب عبدالمطلب ابن ہاشم کے متعلق صراحت آتی ہے کہ وہ ہر سال ایک ماہ کے لیے تحنث کی خاطر مقام تنہائی پر چلے جاتے تھے اور پورا ماہ وہاں گزارتے تھے، ایک روایت کے مطابق تو جناب عبدالمطلب نے ہی یہ سنت شروع کی تھی کہ ہر رمضان میں غار حرا میں تحنث کرتے تھے، دوسرے قریشی اکابر کے باب میں بھی بالعموم اور احناف کے متعلق بالخصوص تحنث کا ذکر آتا ہے، یہ اہم بات ہے کہ رمضان کا مہینہ اس عبادت الٰہی کے لیے خاص کیا گیا تھا، ممکن ہے کہ دین حنیفی رابراہیمی میں رمضان کے روزے فرض رہے ہوں اور عبادات شب و روز بھی اور اسی سے قریش میں تحنث رمضان کا تصور و عمل آیا تھا، مدت عبادت پوری کرنے کے بعد بالعموم یہ بھی سنت تھی کہ لوگ بیت اللہ جا کر طواف کرتے اور مساکین اور غربا کو صدقات دیتے اور کھانا کھلاتے تھے" کان رسول الله ﷺ یجاور فی حراء فی کل سنة شهرا و کان ذلک مما تحنث به قریش فی الجاهلیة فکان رسول الله ﷺ یجاور ذلک الشهر من کل سنة یطعم من جاءه من المساکین فاذا قضی رسول الله جواره من شهره ذلک کان

اول ما یبدأ بہ - اذا انصرف من جوارہ - الکعبۃ قبل ان ید خل بیتہ فیطوف بہا سبعا او ما شاء اللہ من ذلک ......(ابن ہشام ،۱/۲۵۳-۲۵۴، سہیلی ،۲/۳۸۰-۳۸۱، ۳۹۱-۳۹۲)، یہ روایت اگر چہ رسول اکرم ﷺ کے حوالے سے ہے لیکن وہ ہے دراصل قریش مکہ کی سنت ابراہیمی جو پورے مکہ میں مروج و مقبول تھی، احناف مکہ میں بھی تحنث ور رمضان کا عمل موجود تھا جیسا کہ بعض احناف کے حوالے یا تحنث رتحنف کی تعریف میں اوپر گذر چکا ہے، حرم مکہ سے باہر بسنے والے اپنے اپنے مقامات عبادت و تحنث اختیار کر لیتے تھے جیسے حضرت ابوحرمہ بن انس بخاری خزرجی نے اپنے گھر کے احاطے میں ایک مسجد سی بنالی تھی جس میں وہ عبادت کرتے تھے اور اس میں کسی ناپاک شخص کو داخل ہونے نہیں دیتے تھے۔

۲-ختنہ: تمام عرب قبایل میں خواہ وہ مشرک و کافر ہوں یا حنیف و موحد ختنہ کی سنت انبیارائج تھی، ان میں یہ فطرت کی سنت دین ابراہیمی کے سبب ہی آئی تھی، روایات کا بیان ہے کہ احناف بلا استثنا ختنہ پر عمل کرتے تھے، بعض اہل قلم و فکر جیسے اخفش وغیرہ نے ختنہ کی سنت پر عمل کو صرف احناف تک محدود کر دیا ہے اور اسے حنیفیت کی ایک امتیازی علامت مانا ہے، یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ تمام عربوں میں مقبول رواج تھا اور کوئی عرب غیر مختون نہیں ہوسکتا تھا وہ ان کے دین کے خلاف تھا، عربوں کے سوا صرف یہود ختنہ کی نبوی سنت پر عمل پیرا تھے باقی دوسرے مذہبی طبقات اور نسلی گروہ اس سے محروم تھے، حتی کہ عرب نصاریٰ میں بھی ختنہ کی روایت حنفی موجود نہ تھی، غزوۂ طائف کے موقع پر جب بعض مقتولان ثقیف کے ستر کھول کر شناخت کی گئی تو ان میں سے کئی غیر مختون نکلے، ایک عرب مسلم کے شور مچانے پر حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفی کو خدشہ ہوا کہ کہیں ان کی پوری قوم کو غیر مختون قوم نہ سمجھ لیا جائے، انہوں نے موقع کی شہادتیں فراہم کرنی شروع کیں اور خاص ثقفی مقتولوں کے ستر کھولے کہ وہ سب مختون تھے، غیر مختون صرف ثقفی قوم کے نصرانی یا عیسائی غلام نکلے تھے قریش مکہ اور دوسرے تمام قبایل عرب میں ختنہ ایک لازمی سنت تھا: ...... والاختتان من العادات القدیمۃ الشائعۃ بین العرب الجاھلین الوثنیین اما العرب النصاری فلم یکونوا یختتنون فالحنفاء فی ھذہ العادۃ والوثنیون سواء......" (جواد علی ،۶/ ۲۹۶ بحوالہ النصرانیۃ ،۳/ ۱۳۰، ذکر ختنین،

نیز ۶/ ۲۹۷)، شاہ ولی اللہ الدھلوی، حجۃ اللہ البالغہ ،۱/ ۲۷۷-۲۷۸: "...... وفی التوراۃ ان اللہ تعالی جعل الختان مستمدا علی ابراھیم و ذریتہ ......"۔

مشہور مستشرق اے جے وینسنک (A.J.Wensinck) کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کا ختنہ تیرہ بہال کی عمر میں ہو چکا تھا، (ابن سعد، الطبقات، ۱/۱: ۲۴) اس حدیث سے بہ ظاہر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ختنہ کی رسم و رواج تھی...... مزید برآں بہ سند حدیث یہ بات مسلم ہے کہ ختنہ قبل از اسلام کی رسوم میں سے ہے، احادیث میں جہاں دین فطرت کے فضایل کا بیان آیا ہے وہاں ناخن تراشنے، مسواک کرنے، مونچھیں کترنے، داڑھی بڑھانے وغیرہ کے ساتھ ختنہ کا بھی ذکر موجود ہے، (البخاری، لباس، باب ۶۳، مسلم، طہارۃ حدیث ۴۹ تا ۵۰، الترمذی، ادب، باب ۱۴ وغیرہ، شرح مسلم از نووی، طہارۃ)، (مقالہ "ختان"، اردو دائرہ معارف اسلامیہ لاہور و تلخیص از ادارہ، مفصل بحث کے لیے فتح الباری، ۱۰/ ۴۱۲-۴۱۸-۴۲۲)۔

۳-غسل جنابت: دین فطرت، دین حنفی اور دین اسلام میں جنابت کے بعد غسل کرنا فرض و واجب ہو جاتا ہے اور عربوں میں غسل جنابت کا رواج اسی دین ابراہیمی کی تابع داری سے آیا تھا، اس معاملہ میں مشرکین عرب اور احناف دونوں برابر تھے، یثرب کے حنیف حضرت ابوقیس صرمہ بن انس بخاری خزرجی کے تذکرہ میں ان کی علامات حنفی میں سے ایک ان کا غسل جنابت کرنا بھی بتایا ہے، دوسرے احناف عرب کے بارے میں اس کا ذکر نہیں ملتا مگر اسے مضمر سمجھا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ عربوں کا رواج تھا اور دین ابراہیمی کا بقیہ تھا، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے صراحت کر دی ہے کہ غسل جنابت ان کے معمول کی سنت تھی" وانہ من ابواب العبادۃ الطھارۃ وما زال الغسل من الجنابۃ سنۃ معمولۃ عندھم وکذلک الختان و سائر خصال الفطرۃ ......" (حجۃ اللہ البالغہ ،۱/ ۲۷۷-۲۷۸)۔

۴-اللہ کے نام سے ذبیحہ: یہ بحث اوپر امام سہیلی کے حوالے سے آچکی ہے کہ عرب

دین ابراہیمی کی پیروی میں اپنے جانوروں کو اللہ کے نام سے ذبح کرتے تھے، یہ اصول عام جانوروں کے ذبیحہ پر بھی صادق آتا تھا اور حج کی "ہدی" کے جانوروں کی قربانی پر بھی، ان کا ذبیحہ صرف اللہ کے نام پر ہوتا تھا سوائے ان جانوروں کی بھینٹ کے جو وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کے نام سے کرتے تھے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس کی صراحت کی ہے، "ولم تزل سنتهم الذبح في الحلق والنحر في اللبة" (حجة الله البالغة، ۲۷۹/۱) جن علمائے کرام نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مشرکین عرب اپنے جانوروں کی قربانی کسی اور نام سے یا اسم الٰہی کے ذکر کے بغیر کرتے تھے وہ ان کا محض استنباط ہے، صحیح بات یہی ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو بالعموم اللہ کے نام پر ذبح کیا کرتے تھے، حضرت زید بن عمرو بن نفیل عدوی اور رسول اکرم ﷺ بعثت سے قبل صرف نام الٰہی پر ہی کیا ہوا ذبیحہ تناول فرمایا کرتے تھے، یہ واقعہ ہی اور سنت حنیفی ہی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ عرب بتوں کے چڑھاوے کے علاوہ جانوروں کا ذبیحہ اسم الٰہی سے کرتے تھے، ایک بزرگ عبداللہ بن عبدالملک یا حویرث آبی اللحم (گوشت کا انکار کرنے والے) مشہور ہوگئے تھے کہ وہ جاہلیت میں بتوں کے نام سے ذبح کیے جانے والے جانوروں کا گوشت نہیں کھاتے تھے، بعض کا کہنا ہے کہ وہ گوشت سے پرہیز کرتے تھے، "لانه كان لا ياكل ما ذبح على النصب في الجاهلية" (اسد الغابه، ۲۰۰/۳، نیز ۲/ترجمہ حویرث)، اس کا دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ احناف بتوں کے چڑھاوے اور ان کے نام سے کیے ہوئے ذبائح سے احتراز کیا کرتے تھے، شرک اور بت پرستی سے اجتناب تمام احناف کرام کی امتیازی صفت تھی، لہذا حضرت زید بن عمرو بن نفیل کے علاوہ تمام احناف کے بارے میں اس کو ایک حقیقت ثابتہ سمجھا جا سکتا ہے۔

۴- شراب ونشہ آور اشیا سے پرہیز: شراب نوشی کی عام مقبولیت اور رواج عام کے باوجود عرب سماج میں اس کو برا سمجھا جاتا تھا اور پینے والے بھی اس کو اچھا نہیں کہتے تھے، عربی زبان میں اس کا نام خمر (عقل مارنے والی) ہی اس کی برائی کی نشانی اور شہادت ہے، بعض احناف مثلاً حضرت ابوقیس صرمہ بن انس بخاری خزرجی کے متعلق صراحت آتی ہے کہ وہ شراب اور تمام دوسری نشہ آور اشیا سے پرہیز کیا کرتے تھے، حضرت امیہ بن ابی الصلت ثقفی اور بعض

دوسرے شعرائے عرب کے بارے میں روایات آتی ہیں کہ انہوں نے شراب نوشی ترک کر دی تھی، حضور نبی کریم ﷺ اور کئی دوسرے اکابر قریش وعرب کے تذکرے میں بھی یہ وضاحت ملتی ہے کہ وہ شراب سے ہمیشہ بچے رہے یعنی انہوں نے جاہلیت میں بھی کبھی شراب نہیں پی تھی۔

ترک شراب نوشی یا اس سے قطعی اجتناب اتنی اہم سماجی خوبی تھی کہ بعض قدیم سیرت نگاروں اور عرب مولفین نے اس پر خاص فصول باندھی ہیں اور ان اکابر عرب کے اسمائے گرامی تعریف وتوصیف کے ساتھ گنائے ہیں جو ہمیشہ شراب نوشی سے محترز رہے یا جنہوں نے اسے اپنی اندرونی خوبی عفت وطہارت کے سبب ترک کر دیا تھا، محمد بن حبیب بغدادی ان میں سے ایک ہیں، انہوں نے قریش کے ان اکابر کا نام گنایا ہے جنہوں نے جاہلیت میں شراب اور نشہ اور ازلام (جوئے) کو حرام کر لیا تھا، ان کے اسمائے گرامی تھے:

۱- عبدالمطلب بن ہاشم ہاشمی ۲- شیبہ بن ربیعہ عبشمی ۳- حضرت ورقہ بن نوفل اسدی ۴- ابوامیہ بن مغیرہ مخزومی ۵- حارث بن عبید مخزومی ۶- حضرت زید بن عمرو بن نفیل عدوی ۷- عامر بن حذیم جمحی ۸- عبداللہ بن جدعان تیمی ۹- مقیس بن قیس سہمی ۱۰- حضرت عثمان بن عفان اموی ۱۱- ولید بن مغیرہ مخزومی (کتاب المنمق، حیدرآباد دکن، ۱۹۶۴ء، ۵۳۱-۵۳۲)۔

اپنی دوسری کتاب میں مولف مذکور نے بعض دوسرے ناموں کا ذکر کیا ہے، وہ ہیں:

۱۲- العباس بن مرداس سلمی ۱۳- قیس بن عاصم سعدی ۱۴- عامر بن الظرب العدوانی ۱۵- صفوان بن امیہ کنانی ۱۶- عفیف بن معدی کرب کندی ۱۷- الاسلام الیامی الہمدانی ۱۸- ابوذر الغفاریؓ ۱۹- حارث بن عوف کنانی ۲۰- یزید بن جعونہ لیثی ۲۱- عمرو بن عنبسہ سلمی ۲۲- قس بن ساعدہ ایادی ۲۳- عبید بن الابرص اسدی ۲۴- زہیر بن ابی سُلمیٰ مزنی ۲۵- نابغہ ذبیانی ۲۶- نابغہ جعدی ۲۷- حضرت حنظلہ بن ابی عامر یثربی ۲۸- قبیصہ بن ایاس طائی ۲۹- ایاس بن قبیصہ بن ابی غفر ۳۰- قیس بن عاصم ۳۱- مقیس بن صبابہ ۳۲- حاتم طائی، (محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر، مرتبہ ایلزہ لختن شتیتر، حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء، ۲۳۷-۲۴۱)۔

دوسری فہرست میں بغدادی نے کئی معروف احناف کے اسمائے گرامی بھی شامل کیے ہیں اور بعض شعرائے عرب کے اشعار بھی تحریم خمر کے ضمن میں نقل کیے ہیں، احناف کرام کی تعداد

کم از کم دس ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ احناف بالعموم شراب نوشی اور زنا سے بھی پرہیز کرتے تھے، زنا اور بدکاری سے اجتناب دوسری عام صفت شرفائے عرب کی تھی اور احناف اس سے پوری طرح سے متصف تھے جیسا کہ متعدد انفرادی روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے جو دوسرے مصادر میں ملتی ہیں۔

خلاصۂ بحث جاہلی عہد میں دین حنیفی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے سے عربوں کا دین متین رہا، بعثت محمدی سے تین سو سال قبل تک اس کی بنیادی شکل باقی رہی اور عربوں کے تمام قبایل وطبقات دین ابراہیمی کے پیرو رہے، تیسری صدی عیسوی تک جزیرہ نمائے عرب میں سچا دین حنیفی اور دین ابراہیمی قابلِ عمل اور لایق فخر اور عربوں کی دینی شناخت بنا دیا، اس صدی کے اواخر تک پہنچتے پہنچتے بعض انحرافات اور خرافات و بدعات کا کچرا دین اسلام کے چشمۂ صافی کو گدلا کرنے لگا، روایات بالعموم اس کی ساری ذمہ داری ایک مکی سردار عمرو بن لحی خزاعی کے سر ڈالتی ہیں، امکان ہے کہ کچھ دوسرے افراد وطبقات نے بھی انحرافات کی راہ ہموار کی ہو، امتدادِ زمانہ سے دینی فکر اور مذہبی عمل میں راہِ مستقیم سے انحراف ایک مسلم حقیقت ہے۔

اصل دین اور انحراف میں تصادم ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں سماج میں دینی، فکری اور عملی اتھل پتھل شروع ہو جاتی ہے، پہلے اصل دین کے پیروؤں کو غلبہ حاصل رہتا ہے اور رفتہ رفتہ انحراف کی اشاعت سے پانسہ پلٹ جاتا ہے اور انحراف غالب ہو جاتا ہے، پھر بھی اصل دین کے ماننے والے ہر دور میں باقی رہتے ہیں، یہی حقیقت دین ابراہیمی اور دین حنیفی کے ضمن میں بھی قدرتِ الٰہی نے دہرائی اور جب انحرافات نے دین اصلی کو پوری طرح مغلوب کر لیا تو بعثت نبوی کا فیصلہ الٰہی صادر ہوا۔

جزیرہ نمائے عرب کے طول و عرض میں تین سو سالہ دورِ انحراف میں بہت سے نہ سہی تو کافی تعداد میں دین حنیف کے ماننے والے موجود رہے، ان میں افراد بھی تھے اور طبقات بھی اور ان سے زیادہ اہم تھے گمراہوں میں اصل دین کے باقیات قرآنی آیات، احادیثِ نبوی اور عرب روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ دین ابراہیمی کے بہت سے اصول و عقاید اور اعمال و

معمولات انحراف کے مارے عربوں میں بھی موجود و باقی تھے، ان میں اللہ، رسول، آخرت، اعمال کی جزا سزا اور دوسرے عقاید و افکار کے علاوہ بہت سے بنیادی اعمال و اشغال جیسے نماز و روزہ و زکوۃ و حج و ختنہ و غسل جنابت اور دوسرے اعمالِ فطرت پوری طرح مروج تھے۔

انحراف و بدعت سے لڑنے والے اور اصل دین حنیفی کی طرف پلٹنے والے افراد وطبقات نے فکر و عمل کی تطہیر کا کام شروع کیا، جہاں ان کو اصل دین کے بقایا مل گئے، ان کو اختیار کر لیا اور امتداد زمانہ سے جن افکار و اعمال کی صورت مسخ ہو گئی تھی اور اصل حقیقت کا پتہ لگانا ناممکن ہو گیا تھا وہاں انہوں نے فکر و عقیدہ اور عمل و مذہب کی تجریدی شکل اختیار کی اور اپنی سمجھ سے اصل کا سراغ لگایا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے، شرک اور مشرکانہ رسوم کی بجائے توحید و موحدانہ کیش اختیار کیا، بتوں اور اصنام کی پوجا چھوڑی ان سے متعلق رسوم و اعمال سے گریز کیا اور رب ابراہیم علیہ السلام کی عبادت اور عبادتِ الٰہی سے وابستہ اشغال میں لگ گئے، اللہ واحد کے تصور اور عقیدہ نے ان کے عمل کی تطہیر میں بنیادی کردار ادا کیا۔

مکہ مکرمہ خانہ کعبہ کا گھر ہونے کے سبب دین حنیفی کا مرکز و ماویٰ بنا رہا، قریش میں ایسے افراد و جماعات ہمیشہ موجود رہے جو دین حنیفی کے علم بردار اور پیرو تھے، علمائے اصولیین کا اتفاق ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جناب محمد بن عبداللہ ہاشمی کے تمام آبا و اجداد میں دین حنیفی کے بنیادی افکار و اعمال ہمیشہ پیوست رہے، کئی دوسرے افراد گروہ بھی احناف کے زمرے میں شامل تھے جیسے حضرات زید بن عمرو بن نفیل عدوی، ورقہ بن نوفل اسدی، عثمان بن حویرث اسدی، عبید اللہ ابن جحش اسدی خزیمی، ابو کبشہ و جز بن غالب زہری وغیرہ، مدینہ منورہ بھی احناف کے وجود گرامی سے کبھی محروم نہیں رہا، ان میں ابو قیس صرمہ بن انس بخاری خزرجی، ابوالہیثم بن التیہان، ذکوان بن عبد قیس، اسعد بن زرارہ اور متعدد دوسرے دین حنیفی کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔

دوسرے قبایل وطبقات عرب میں طائف و ہوازن کے بنو ثقیف، بنو سلیم، بنو سعد بن بکر، بنو کنانہ، ہمدان، کندہ، حمیر، غفار و اسلم، لیث، ایاد، بنو بکر بن وائل، عبد القیس، عبس و ذبیان، مزینہ و جہینہ، طے و اسد، خزیمہ، حمیر و حضر موت، بنو عامر بن صعصعہ، بنو المصطلق، بنو عاد، تمیم، قضاعہ اور کئی دوسرے طبقات شامل تھے اور احناف کے وجود گرامی سے مشرف، ان قبایل وطبقات

کا جغرافیائی تعلق جزیرہ نمائے عرب کی چار سمتوں اور تمام علاقوں سے تھا، یمن اور جنوبی عرب میں حنفی طبقات کی کثرت تھی۔

احناف عرب اور دین حنفی کے پیروؤں نے دہرا فرض انجام دیا، اس کا تعلق ماضی کی میراث کی حفاظت سے بھی تھا اور مستقبل کی تعمیر کی ہمواری سے بھی، انہوں نے دین حنفی کو زندہ کرنے اور رواج دینے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ساتھ بعثت محمدی کے ہراول دستہ کا کام کیا، عرب سماج میں یہی وہ فکری اور دینی طبقہ تھا جس نے اپنے عقیدہ وعمل سے نبی آخرالزماں ﷺ کی تشریف آوری کا منتظر ایک دنیا کو بنایا اور جب آپ ﷺ کے وجود گرامی اور ظہور سامی سے عرب کی سرزمین سرشک آسمان بنی تو یہی احناف اور حنفیت کی روح تھی جس نے سب سے پہلے بعثت محمدی کو قبول کیا اور اسے اصل دین حنفی بنادیا۔

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کی نئی کتاب

دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات (حصہ اول)

از پروفیسر خورشید نعمانی

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی ملک کا ممتاز علمی، ادبی، تحقیقی اور تصنیفی ادارہ اور علامہ شبلی کی یادگار ہے، اس نے اسلامی علوم وفنون، سیرت وسوانح، اسلام اور ہندوستان کی تاریخ اور شعر وادب سے متعلق مستند محققانہ کتابیں شائع کرکے اردو لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے، ان کتابوں نے قوم کی ذہنی ودماغی تربیت بھی کی اور اس کے اندر صحیح علمی مذاق بھی پیدا کیا۔

زیر نظر کتاب میں دارالمصنفین کی پرعظمت تاریخ، شاندار خدمات اور ولولہ انگیز علمی کارناموں کو حیطۂ تحریر میں لایا گیا ہے، مصنف شبلی اسکول کے ایک فرد، دارالمصنفین کے عظمت شناس اور اچھا علمی، ادبی اور تحقیقی ذوق رکھتے ہیں۔

یہ کتاب دو حصوں میں مکمل ہوگی، حصہ اول کے پہلے باب میں دارالمصنفین کا تخیل اور اس کے قیام کی سرگزشت بیان کی گئی ہے، دوسرے باب میں علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی اور دارالمصنفین کے رفقا، مصنفین اور منتسبین کے حالات وخدمات درج ہیں، تیسرے باب میں دارالمصنفین کی مختلف النوع علمی، ادبی اور تاریخی کتابوں پر مبسوط تبصرہ کیا گیا ہے، جس کے شروع کا حصہ اس جلد میں بھی آگیا ہے۔ قیمت: ۱۴۰ روپے

خواجہ میر درد اور ''علم الکتاب''

از پروفیسر نثار احمد فاروقی ☆

خواجہ میر درد فارسی نثر میں سلوک وتصوف کے موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں یہ کتابیں معلوم اور دست یاب ہیں:

۱-علم الکتاب ۲- نالۂ درد ۳- آہ سرد ۴- درد دل وشمع محفل (مطبع کبیری سہسرام ۱۲۶۷ھ)۔

یہاں صرف ان کی تصنیف ''علم الکتاب'' کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائے گا، اس میں دو حصے ہیں اور ہر حصے میں ایک سو گیارہ رسایل ہیں جنھیں درد نے ''واردات'' کہا ہے اور ہر رسالے کو جداگانہ نام دیا ہے، دوسرے حصے کے ہر رسالے میں انہوں نے اپنی فارسی رباعیات درج کرکے ان کی تشریح وتفسیر کی ہے، علم الکتاب میں درد کی سو سے زیادہ فارسی رباعیات آگئی ہیں، جو تقریباً سب مسایل تصوف، توحید، فنا وبقا اور نظریۂ وجود کے موضوع پر ہیں۔

علم الکتاب کے بیشتر رسایل کی تصنیف ۱۱۷۲ھ (۹-۱۷۵۸ء) میں ہو چکی تھی، پھر ان کو صاف کرنے اور ان میں اضافے کرنے کا عمل ۱۱۸۱ھ (۸-۱۷۶۷ء) تک ہوتا رہا، اس طرح کتاب کی تصنیف نو۹ سال تک جاری رہی، کتاب کا موضوع تصوف بھی ہے، توحید بھی، شریعت وطریقت بھی، فارسی نثر میں اس کا اسلوب زیادہ پیچیدہ اور معلق نہیں ہے، درد مقفی ومسجع نثر نہیں لکھتے، ان کا اسلوب عموماً صاف اور رواں ہے جسے سمجھنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آتی، البتہ ان کی فارسی سے پوری طرح مستفید ہونے کے لیے ان کی بعض مخصوص علمی اصطلاحوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔

☆ ہلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

اس کتاب کے قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں مل جاتے ہیں اور اسے ۱۳۰۹ھ (۲-۱۸۹۱ء) میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے فرزند نواب سید نورالحسن خاں نے مطبع انصاری لکھنؤ سے شایع بھی کیا تھا اور اب اس کے اردو ترجمے کی دو جلدیں ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور سے چھپ چکی ہیں، علم الکتاب کا مطبوعہ نسخہ 14+27 سینٹی میٹر سائز کے ۶۴۸ صفحات کو محیط ہے، اس کا مسطر ۲۷ سطری ہے، پوری کتاب میں تقریباً سوا چار لاکھ الفاظ ہیں۔

علم الکتاب میں زیادہ تر فلسفۂ وجود، توحید اور تصوف کے مباحث ہیں، ایسا مواد بہت ہی کم ہے جس سے درد کے سوانحی حالات لکھنے میں مدد مل سکے، ایک موقع پر وہ اپنے نام کی تشریح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ خواجہ اور میر دونوں ''بحسب اختلافِ لغات ولایات'' سادات کے لقب ہیں، خواجہ بہ معنی مالک و سردار و صاحب و مولیٰ ہے، اس لیے اکبرِ سادات کو خواجہ کہا گیا، مگر اس کا کوئی قابل اطمینان حوالہ نہیں دیا، ''خواجہ'' دراصل ترکی زبان کا لفظ ہے اور وہاں محض آقا یا سردار کا مفہوم رکھتا ہے، درد کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے ان کے مورثِ اعلیٰ خواجہ بہاء الدین نقش بندؒ سے ملتا ہے جو ساداتِ حسینی میں سے ہیں اور وہ تیرہویں پشت میں حضرت حسن عسکریؒ کے فرزند ہیں، اس طرح درد کا شجرۂ نسب ۳۶ واسطوں سے حضرت علی بن ابی طالبؑ پر منتہی ہوتا ہے، اپنے نسب کے بارے میں درد کا بیان ہے:

''تا الآن آباء و اجداد پدری و مادری الی انفسنا و ذریاتنا و نسائنا و ہمہ اطراف ایشان سادات صحیح النسب و ذوات رفیع الحسب بودہ اند و ہستند''۔

اس وقت تک ددھیال و ننھیال والے سب آبا و اجداد ہم تک، ہماری اولاد اور خواتین تک اور ان کے سب رشتے ناتے والے ساداتِ صحیح النسب اور اچھی بڑی حیثیت والے رہے ہیں۔

میر درد کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب اپنے وقت کے بڑے درویش، فارسی کے شاعر اور عالم تھے، وہ ۱۱۰۵ھ (۹۴-۱۶۹۳ء) میں پیدا ہوئے تھے، ''وارثِ علم امامین وعلی'' سے تاریخ ولادت معلوم ہوتی ہے جسے درد نے یوں نظم کیا ہے:

در وجود آمد چو ذاتِ آن ولی شد کمالاتِ امامت از و جلی

سال تاریخش مرا الہام شد ''وارثِ علم امامین و علیؓ'' (۱۱۰۵ھ)

درد کہتے ہیں کہ ''میر'' بھی سادات کو کہا جاتا ہے، درد کی دادی حضرت سید عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں تھیں، ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے سیادت کی نسبت ظاہر کرنے کے لیے ان کے نانا میر سید محمد حسینی قادری بن نواب میر احمد خاں شہید نے اپنے نواسے کا نام ''خواجہ میر'' رکھا تھا، یہ نواب میر احمد خاں شاہ عالم اول کے سہ ہزاری امرا میں سے ہیں، برہان پور کے صوبے دار تھے، وہیں ایک معرکے میں ۱۰؍صفر ۱۱۲۲ھ (۹؍اپریل ۱۷۱۰ء) کو شہید ہوئے تھے، ان کے بیٹے میر سید محمد الحسینی الاندجانی اپنے وقت کے مشایخ میں سے تھے، ۸۰ سال پانچ ماہ کی عمر پاکر ۲؍جمادالثانیہ ۱۱۵۷ھ بروز شنبہ (۱۱؍جولائی ۱۷۴۴ء) کو دہلی میں فوت ہوئے، ان کے نانا خواجہ عبدالرحیم خاں (وفات ۱۱۰۳ھ/۲-۱۶۹۱ء) امرائے عالم گیری میں سے ہیں۔

درد کے ایک چھوٹے بھائی کا نام خواجہ محمد میر ہے، اسم مبارک محمد دونوں بھائیوں کے نام میں امتیاز کے لیے رکھا گیا، یہ محمد میر وہی ہیں جن کا تخلص اثر ہے، ان کا اردو دیوان اور ایک مثنوی خواب وخیال دونوں مشہور ہیں، محمد میر اثر سے چند سال بڑے ایک بھائی ''سید میر'' تھے، یہ عین عالم جوانی میں ۱۹ سال کی عمر میں ۵؍ربیع الثانی ۱۱۶۳ھ (۱۳؍مارچ ۱۷۵۰ء) کو فوت ہوگئے تھے۔

درد کے ایک بھائی ان سے بڑے بھی تھے، ان کا نام میر محمد محفوظ محمدی تھا، ان کی ولادت ۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) میں ہوئی تھی، محمد محفوظ تاریخی نام ہے، یہ بھی عین شباب میں ۲۹ سال کی عمر میں ۱۶؍رجب ۱۱۵۴ھ (۲۶؍ستمبر ۱۷۴۱ء) کو فوت ہوئے۔

درد کے ایک بیٹے صاحب میر کا نام ہمیں معلوم ہے، عطاء اللہ غمیں رام پوری کے دیوان نوشتہ کفایت علی موزوں (کتب خانہ رضا ۱۷۳۷، ورق ۳۹ ب) میں ایک مخمس صاحب میر کی مدح میں ملتا ہے جس کی ٹیپ یہ ہے:

عندلیب با اثر از گلشن حق ، پیر من حافظ و ناصر بہ وقت درد، صاحب میر من

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب سلسلہ تھے اور عطاء اللہ غمیں ان کے مرید تھے۔

درد کہتے ہیں کہ علم الکتاب کے بیشتر رسایل خواجہ محمد ناصر عندلیب کی حیات میں لکھے

جاچکے تھے، مگر وہ متفرق حالت میں پڑے ہوئے تھے، درد کے چھوٹے بھائی میر محمد اثر نے خواہش ظاہر کی کہ ان مسودات کو صاف کرکے یک جا کیا جائے، جو مجمل ہیں انہیں تفصیل سے لکھا جائے، درد کہتے ہیں:

"بہ موجب مرضی ایشان بر چندے ازان کمیت قلم راندہ و بہ جلو ہر رباعی پیادۂ نثری دوانده و آخر آن ہر عبارت نیز رباعی از رباعیات خود تحریر نمودہ وحسنے دیگر در کلام فزودہ"۔

ان کی خواہش کے مطابق میں نے کچھ پر قلم چلایا اور ہر رباعی کے ساتھ ایک نثر کا پیادہ دوڑایا اور ہر عبارت کے آخر میں بھی اپنی رباعیوں میں سے ایک رباعی درج کردی۔

اس کتاب کا کچھ حصہ درد کے والد محمد ناصر عندلیب نے سنا بھی تھا اور پسند کیا تھا، درد کہتے ہیں:

"کلماتے کہ از راہِ عنایت در حق ایں احقر ارشاد می فرمود خود چہ بیان نمایم کہ یک بار ہم بہ شرفِ صحبتِ مشرف گشتہ است، شنیدہ باشد"۔

جو کلمات از راہِ عنایت وہ اس احقر کے بارے میں ارشاد فرماتے تھے، اب میں خود کیا عرض کروں، جو کوئی ایک بار بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوگا اس نے سنے ہوں گے۔

اسی سال شنبہ ۲/شعبان ۱۱۷۲ھ (۳۱/مارچ ۱۷۵۹ء) کو عصر و مغرب کے درمیان خواجہ محمد ناصر کی وفات ہوگئی۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بارے میں علم الکتاب سے دو باتیں اور معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ ان کے طریقۂ محمدیہ کا ظہور کیسے ہوا؟ اس کے بارے میں درد کہتے ہیں "اس زمانے میں ایک ہفتے تک وہ دن رات ساکت رہے اور عالم ناسوت کی طرف ہرگز متوجہ نہ ہوئے، حتی کہ بعض ضروری بشری تقاضے جیسے کھانا پینا سونا وغیرہ بھی پورے نہیں کیے، اپنے مخصوص حجرے میں تنہا بند ہوگئے تھے، بس فرض نمازوں کے وقت ہم لوگ ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے کو حاضر ہوا کرتے تھے، میں کیا بتاؤں کہ اس وقت ہماری کیا حالت تھی، ان کے حجرے کا دروازہ ہر وقت بند رہتا تھا اور میں دہلیز پر پڑا ہوا چپکے چپکے روتا رہتا تھا، میری نیند اور بھوک بالکل اڑ گئی تھی، ایک بار والدہ صاحبہ نے بہت تاکید کے ساتھ مجھے حویلی میں طلب کیا اور اپنے سامنے بٹھا کر نہایت اصرار سے کچھ کھانے کو کہا تو میں نے تعمیل حکم میں چند لقمے کھائے پھر بھاگ کر حجرے کی دہلیز پر

آگیا، دوسرے لوگ نماز کے وقت آتے تھے اور نماز پڑھ کر چلے جاتے تھے، مگر میں وہیں زمین میں پڑا رہتا تھا، والدہ صاحبہ کو میرے اس طرح پڑے رہنا سخت ناگوار تھا، وہ ملازموں کو تاکید کرتی تھیں کہ میرے پاس رہیں مگر میں کسی کا موجود رہنا گوارا نہ کرتا تھا، وہ بستر تکیہ وغیرہ بھیجتی تھیں تو اسے بھی استعمال نہ کرتا تھا، اسی بے اختیاری کے عالم میں کبھی کبھی نیند آجاتی تھی، بہرحال آٹھویں دن اللہ نے فضل کیا اور والد صاحب نے اپنے دست مبارک سے دروازہ کھولا، مجھے یوں پڑا پایا تو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا، سینے سے لگایا، میری پیشانی کو بوسہ دیا اور بہت سے بشارت کے کلمات ارشاد فرمائے جنہیں اب دہرانا بھی ممکن نہیں۔

یہ گویا طریقہ محمدیہ کا طلوع تھا، سب سے پہلے خواجہ میر درد نے اس سلسلے میں بیعت کی، درد کہتے ہیں:

الحمد للہ الذی جعلنی اول المحمدیین الخالصین و انی امرت ان اکون اول من اسلم و اول من بایع علی یدابی فی ہذہ الطریقۃ الوثیقۃ العلیۃ الخاتمۃ والحمد للہ رب العالمین۔

الحمد للہ جس نے مجھے محمدیین خالصین میں پہلا بنایا اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں اسے تسلیم کرنے والوں میں پہلا رہوں اور پہلا جس نے اپنے باپ کے ہاتھ پر اس مضبوط اور بلند اور آخری سلسلے میں بیعت کی، الحمد للہ رب العالمین۔

علم الکتاب میں اتنے کثیر اور متنوع مباحث آگئے ہیں کہ ایک مضمون میں ان کے عنوانوں کو گنانا بھی ممکن نہیں، اس لیے کہیں کہیں سے تعارف کرایا جاسکتا ہے، الکتاب قرآن کریم کو کہا جاتا ہے مگر درد نے اپنی کتاب کے نام کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بہ لحاظ الف لام جنس و استغراق ملحوظ جمیع کتب من حیث افرادھا ست کہ خلاصہ و زبدۂ ہمہ است و حاصل و مآلِ جملہ و مغز و علم آنہا ست وہم نتیجہ و علم جمیع کتب است

اس میں الف اور لام جنس اور استغراق کے لیے ہے اس اعتبار سے یہ ساری کتابوں کا نچوڑ اور خلاصہ، مقصود اور مغز اور سب کے علم کا حاصل ہے، ان کے وجود کے لحاظ سے بھی اور جو

من حیث ذواتھا و ملتویتھا ''۔ کچھ ان میں لکھا ہے اس اعتبار سے بھی۔

اس کے مطالب و مضامین کو انہوں نے واردات کہا ہے جو بہ طور الہام من جانب اللہ ان پر القاء ہوئے ہیں، وہ اللہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

باب ہدایت از پردۂ من برایں باکشادی و غریق بحر توحید کردہ خواستی کہ خود با خود بہ سخن پیوندم ...... و خواستی کہ اسرار خود چوں قلم از زبان من بیان نمائی و مانند شجرۂ موسیٰ دریں جسم نامی تکلم فرمائی۔

تو نے میرے پردے سے ان لوگوں پر ہدایت کا دروازہ کھول دیا اور مجھے توحید کے سمندر میں غرق کر کے چاہا کہ میں خود سے ہی باتیں کروں ...... اور چاہا کہ تو قلم کی طرح میری زبان سے اپنا بیان کرے اور حضرت موسیٰ کے شجر کی طرح میرے جسم میں کلام فرمائے۔

موضوع کتاب کے بارے میں وہ کہتے ہیں ''موضوع ایں کتاب حضرت رب الارباب است'' کوئی ناسمجھ یہ گمان نہ کرے کہ لفظ ''موضوع'' کا اطلاق حضرت حق تعالیٰ پر کیسے ہوسکتا ہے جو خود ہر موضوع کا واضع اور ہر مصنوع کا صانع ہے مگر یہ واہمہ لفظی مفہوم سے پیدا ہوسکتا ہے اور میری مراد اصطلاحی معنی سے ہے، پھر وضاحت کرتے ہیں کہ اس لفظ کے اطلاق سے جو عوارض لازم آتے ہیں ان سے مغالطہ نہ ہونا چاہیے، اللہ نہ جوہر ہے نہ عرض ہے اس کے باوجود امتیازِ ذات و صفات، اضافات و شیونات و کمالات اس کی ذاتِ اقدس میں ثابت ہیں، صفات اعراض ہیں اور جوہر ذات میں قایم ہیں مگر اس کی پاک ذات جوہریت و عرضیت سے بالاتر ہے، لہذا اس کی تنزیہ عین تشبیہ اور تشبیہ عین تنزیہ ہے، تمام اضافتوں سے مبرا ہونے کے باوجود سارے اعتبارات اسی سے متحقق ہیں۔

شریعت، طریقت اور حقیقت کے مراتب سے گفتگو کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ حقیقتِ امر تو ایک ہی ہے، الفاظ اور اسما کی کثرت سے شبہات پیدا ہوتے ہیں، جو فکر سلیم نہیں رکھتے وہ بے جا تر ددات میں پڑ جاتے ہیں، چاروں مراتب شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت میں کوئی مغایرت نہیں، کج فہم انہیں ایک دوسرے سے جدا سمجھتے ہیں، اس لیے ان مراتب میں شریعت کا رتبہ کم تر جانتے ہیں، یہ محض واہمہ ہے، جو کچھ ہے وہ شریعت ہی ہے، یہ

چاروں مراتب ایک دوسرے کے عین ہیں کہ شریعت صورتِ حقیقت ہے، حقیقت معنی شریعت ہے، طریقت شریعت سے اتصاف کا نام ہے، معرفت انکشافِ حقیقت ہے، لہذا شریعت ظاہر ہے اور اسلام اس سے متعلق ہے، طریقت باطن ہے اور ایمان اس سے وابستہ ہے، معرفت سرّ ہے جو ہر شے کی کُنہ سے متعلق ہے اور حقیقت سرّ السر (بھیدوں کا بھید) ہے جو ذات الاشیاء ہے اور ہر شے میں دائر و سائر ہے، یہ سب مراتب حقیقت کی سیڑھیاں ہیں اور ان کا ظہور بہ حسب حیثیات ہوتا ہے، اس علم کو وہ علم الٰہی محمدی کہتے ہیں مگر یہ علمِ الٰہی وہ نہیں جو فلاسفہ کی اصطلاح ہے بلکہ اس مقام پر وحدت الٰہیہ کسوتِ محمدیہ میں جمع ہوگئی ہے اور قامتِ فردیت نے خلعت جامعیت پہن لیا ہے۔

فلاسفہ کا علم مجردات کی قید میں ہوتا ہے، علم حق تمام موجودات کو محیط ہے، اس لیے ''محمدیانِ خالص'' کو علم الٰہی سے پوری نسبت حاصل ہے، نورِ رحمانی سے ہر حقیقت ان پر روشن ہوگئی ہے، اس لیے ان کا سارا علم خواہ علوی ہو یا سفلی، طبیعی ہو یا الٰہی، سب علم الٰہی ہے، اس علم الٰہی کو صوفیہ کا اصطلاحی علم بھی نہ سمجھا جائے جسے ''تصوف'' کہتے ہیں، اس زمانے میں جاہلوں نے تصوف کے جو معنی مشہور و معروف کر رکھے ہیں اور ان میں اپنی طرف سے مہمل بے سرو پا باتوں کے کلی پھندنے لگا دیے ہیں وہ سب محض الحاد ہے، ہیچ و پوچ ہے، بے بنیاد ہے، باقی رہے سچے صوفی جو اہلِ ایقان ہیں، ان میں بھی ایک گروہ اہل مواجید و احوال اور صاحبان اعمال و اشغال کا ہے جو خود کو صوفی کہلواتے ہیں، ان بے چاروں کو تحقیق اور معرفت سے کیا واسطہ؟ جو صاحب حال محقق ہیں ان کے سامنے یہ کس شمار و قطار میں ہیں!۔

دوسری قسم ان اہل تحقیق اور صاحبان علم و عرفاں کی ہے کہ علم تصوف دراصل ان کی تحقیقات سے ہی عبارت ہے، ان کی تحقیقات حکما و متکلمین کے مطالب سے بالا و برتر ہیں، ان حضرات کے کلام میں مغز ہوتا ہے اور ان کا طریقہ حکمائے اشراقیین سے مشابہ ہے، مگر ان کا علم بھی اضافی علم ہے کہ صوفیہ نے اپنی کچھ اصطلاحیں وضع کر لی ہیں اور وہ اپنے مطالب کو ان اصطلاحوں پر منطبق کرتے ہیں، محمدیوں کا علم خالص علم حقیقی ہے جو زبان مصطفوی سے کلام کرتے ہیں اور مطالب کو اسی نہج پر بیان کرتے ہیں جو وہ نفس الواقع میں ہیں، محمدیوں کا کلام سراسر کلام اللہ کی

تفسیر ہے اور قول رسول ﷺ اس پر گواہ ہیں، معقولی علما ان شہسواروں کی رکاب میں دوڑتے ہیں اور اصحاب تصوف کے کلمات ان بُراق سواروں کی پیروی کرتے ہیں، یہ متکلمین والا علم نہیں جس میں خطا و صواب کا احتمال رہتا ہے، وہ اپنے علم کی تعریف میں کہتے ہیں کہ یہ "علم ماموز" ہے جس سے عقاید دینیہ کے اثبات کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔

تصوف کا امر چند اصطلاحوں کا جاننا ہے جو صرف ونحو کے قواعد کی طرح کتابوں سے بھی معلوم ہو سکتی ہیں، فلاسفہ کی حکمت کچھ اعتباری حدود اور اشیا کی ان اضافی قیود کا بیان ہے جو علم بشری سے متعلق ہیں، علم کلام "چند مسایل زائدۂ بے فایدہ" کا اثبات ہے جن کو عقلی دلیلوں سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

وحدت وجود "تقریر بے ادبانہ و بیان مستانہ" ہے جو ناقص علم والے مغلوب الحال لوگوں کو ابتدا میں پیش آتا ہے، اس سے بہت سے کم فہم عوام کو نقصان پہنچتا ہے، وحدت شہود وہ حالت ہے جو کثرت شوق اور جذبے کے غلبے سے حقیقت کو سمجھے بغیر طاری ہوتی ہے، یہ اکثر سالکوں کے لیے مفید ہے۔

علم الٰہی محمدی کلام اللہ اور احادیث رسول ﷺ کی مرادات کو نور ایمان کی قوت اور کشف وعرفان کے شواہد کے ساتھ دیکھنا ہے جو خواص وعوام سب کے لیے مفید ہے، محمدیان خالص جس حکمت سے ممتاز ہیں وہ خیر مطلق ہے، مظہر نور حکمت حق ہے۔

علمائے متکلمین کی دلیلیں فلاسفہ کے مقابلے میں سست ہیں، اس لیے کہ متکلمین پہلے اپنے ذہن میں مسئلہ تراشتے ہیں پھر اس کے لیے دلیلیں جمع کرتے ہیں، چاہے وہ مسئلہ معقول اور مدلل ہو یا نہ ہو، اپنے دعوے کو مستحکم کرنے کے لیے زور زبردستی سے دلیلیں اکٹھی کرتے ہیں چاہے اس مسئلے کا ثابت کرنا دلایل عقلی کا متحمل نہ ہو۔

جیسے متکلمین اپنے اوہام میں گرفتار ہیں اسی طرح فلاسفہ اپنی عقل کے آگے بے اختیار ہیں، ان کی عقل نے نگاہ باطن کو چندھیا دیا ہے اور علمائے ظاہر کی آنکھوں کے نور نے ان کے نور عقل کو دھندلا دیا ہے کہ بس وہ ظاہری امور کو دیکھتے ہیں، عقل سے کام نہیں لیتے، اسی طرح فلاسفہ صرف عقل کا استعمال کرتے ہیں "درک امری" نہیں کرتے جو مرتبہ عقل سے برتر ہے، ان

کی دلیلیں ہر چند معقول ہوں مگر وہ نور حقیقت سے بے بہرہ ہیں، اس کے نتایج سے قرب الی اللہ میسر نہیں ہوتا، علما الفاظ میں بند ہیں، حکما معانی کی قید میں ہیں، حالاں کہ الفاظ اور معانی دونوں ہی اعتبارات میں سے ہیں حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

وہ اولیائے اکملین اور عرفائے محققین ہیں جو شہود حقیقت سے شرف یاب ہوتے ہیں انہوں نے علما وحکما کی دلیلوں کو جو مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی ہیں تار تار کردیا ہے، ان بزرگوں کا کلام عقلاً ونقلاً ثابت ہوتا ہے، ظاہر و باطن میں آیات واحادیث سے مطابقت رکھتا ہے، ان پر دلیل سے پہلے مدلول ظاہر ہوجاتا ہے، پھر وہی مدلول دلیل سے اور زیادہ روشن ہوکر مرتبۂ شہود میں آتا ہے، ان کی حکمت حکمتِ الٰہی اور ان کا علم لامتناہی ہے۔

درد کی اس تصنیف میں فلسفہ وتصوف، توحید واصول عقاید کے بہت سے رموز ونکات بیان ہوئے ہیں اور یہ زیادہ تر ان کے اپنے مکشوفات یا مزعومات ہیں، دوسری کتابوں کے حوالے کم ہی آئے ہیں، بعض مسایل میں انہوں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات یا ابوطالب مکی کی قوت القلوب یا علامہ تفتازانی کا حوالہ دیا ہے، ان کا سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ ہے مگر مجددی سلسلے میں سماع اور غنا کا جواز نہیں جب کہ درد کی خانقاہ میں سماع پابندی سے ہوتا تھا، انہوں نے کتاب وسنت کے حوالے سے ایک نیا طریقہ "محمدیہ" قایم کرکے اس کے اصول وقواعد اور امتیازات کا اظہار کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے مگر اس میں ان کا ذہن واضح نہیں ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ محمدیین الخالصین کے علم کو دوسرے سلسلوں پر کیوں ترجیح دی جائے کیوں کہ کوئی ترجیح بغیر مرجح معتبر نہیں ہوتی، وحدت وجود کے ماننے والوں کو وہ کم عقل کہتے ہیں اور یہ کہ ابتدائے سلوک میں یہ مقام مبتدیوں کے سامنے آتا ہے اور اس سے کم فہم عوام کو نقصان پہنچتا ہے، میں یہ باور نہیں کرسکتا کہ وحدت الوجود کے موضوع پر کبار صوفیہ، مسلم علما اور فلاسفہ کی تصانیف اور ان کے مرتبے سے درد واقف نہ ہوں گے، صرف حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی تصانیف کی ہی کتنی شرحیں کبار صوفیہ نے ہر دور میں لکھی ہیں، رہا یہ کہ اس سے عوام گمراہ ہوتے ہیں تو یہ دعویٰ کب کیا گیا ہے کہ یہ فلسفہ عوام کے لیے ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درد کا سلسلہ نقشبندیہ محمدیہ کچھ ہی عرصے تک رایج رہا، اب اس کے آثار نظر نہیں آتے، کتاب اتنی ضخیم ہے کہ اسے آج کی

تیز رفتار دنیا میں وہی پڑھ سکتا ہے، جس کے پیچھے کوئی اور بکھیڑا لگا ہوا نہ ہو۔

مصادر اور مراجع

فص الکلمات (قلمی) ورق ۱۴۹ الف۔

سراج الدین علی خان آرزو: مجمع النفائس (قلمی) رام پور، ورق ۱۵۰۔

قدرت اللہ شوق: جام جہاں نما (قلمی)، ج ۲ ورق ۳۹۳ ب، کتب خانہ رضا رام پور۔

ایضاً: تکملۃ الشعرائے جام جمشید (قلمی)، ورق ۲۳۷، رام پور۔

قیام الدین حیرت: مقالات الشعرا، مرتبہ نثار احمد فاروقی، علمی مجلس دہلی۔

ناصر نذیر فراق دہلوی: میخانۂ درد۔

ڈاکٹر سید عبداللہ: درد کی شاعری کا صوفیانہ لب ولہجہ، ادب لطیف (لاہور)، سالنامہ ۱۹۵۰ء۔

خلیل الرحمن اعظمی: خواجہ میر درد کوچۂ محبوب میں، نگار لکھنؤ، ج ۶۲، ش ۲ (اگست ۱۹۵۲ء)۔

فرمان فتح پوری: درد کی شخصیت تصوف اور شاعری، ادب لطیف (لاہور) ج ۴۶، ش ۴، مئی ۱۹۵۹ء۔

الف۔د۔نسیم: خواجہ میر درد کے کلام میں نظام تصوف کی تلاش، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، ج ۳۵، ش ۳، مئی ۱۹۵۹ء۔

امجد کندیانی: میر درد کی ایک خصوصیت (دعوت مشاہدہ)، نگار پاکستان، اپریل ۱۹۶۴ء۔

میر درد کی علامات، قندیل لاہور، ۲۱ر جولائی ۱۹۶۳ء۔

خواجہ میر درد: علم الکتاب، مطبع انصاری لکھنؤ، ۱۳۰۹ھ۔

خیراتی لال بے جگر: تذکرہ گلزار سخن (قلمی)، برٹش لائبریری، لندن۔

عبدالحمید یزدانی: خواجہ میر درد اور ان کا خاندان، رسالہ ادیب (علی گڑھ)، ج ۹، ش ۱-۲، جنوری وفروری ۱۹۶۳ء، قسط ۲، ج ۹، ش ۳-۴، مارچ واپریل ۱۹۶۳ء۔

عبدالودود (قاضی): درد دل، مصنفہ خواجہ میر درد، رسالہ آج کل (اردو)، اکتوبر ۱۹۶۰ء۔

مثنوی بہرام وگُل اندام

از ڈاکٹر نورالسعید اختر ☆

ساسانی عہد کے چودھویں حکمراں بہرام گور بن یزدجرد کو تاریخی وادبی اعتبار سے بہت شہرت حاصل ہے، بہرام گور کی شجاعت، جواں مردی اور عاشقانہ معرکے ایرانی شعرا اور داستان گویوں کے پسندیدہ موضوع رہے ہیں، فردوسی طوسی اور خدائے سخن نظامیؔ گنجوی سے لے کر امین الدین محمد امیںؔ اصلاً طوسی مشہور بہ سبزواری تک، فارسی زبان وادب میں یہ داستان منظوم ومنثور انداز میں اہلِ ادب کی تشنگی دور کرتی رہی ہے، اس داستان کی مقبولیت نے قدیم اردو کے شعرا اور نثر نگاروں کو بھی اپنی طرف راغب کیا، لہذا بیجاپور میں امیںؔ ودولتؔ نے "بہرام گور و بانوئے حسن" کے عنوان سے دکنی اردو میں ایک یادگار مثنوی یادگار چھوڑی، اسی داستان کو آخری قطب شاہی تاج دار ابوالحسن تانا شاہ کے دور میں طبعیؔ گول کنڈوی نے دکنی اردو میں پیش کیا، داستان کے اعتبار سے طبعی کی مثنوی امین الدین محمد امین سبزواری کی فارسی مثنوی "بہرام وگل اندام" کا دکنی روپ ہے۔

فارسی ادب کی عشقیہ مثنویاں عوام الناس میں بے حد مقبول رہی ہیں، ان میں نظامیؔ گنجوی، جامیؔ، میرزا محمد امیںؔ، میر جملہ شہرستانی، صلحیؔ خراسانی اور امیر خسروؔ دہلوی کی مثنویوں کو فوقیت حاصل ہے، ان کے علاوہ کئی اور مثنویاں ہیں جن میں بہرام گور کو داستان کا ہیرو بنا کر مثنوی کا پلاٹ ترتیب دیا گیا ہے، لہذا بہرام گور کی شخصیت کے پیش نظر اس کی تاریخی حیثیت پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ایران میں اشکانی خاندان کے بعد ساسانیوں کا دور شروع ہوا، اس خاندان کا پہلا بادشاہ ۲۲۶ء میں تخت نشین ہوا، بہرام گور اس سلسلے کا چودھواں[۱] بادشاہ ہے، بہرام گور یزدجرد اثیم،

☆ پونم پرگتی، ایل-ون-ایف ۱۰۷/، پونم نگر، اندھیری ایسٹ، بمبئی-۹۳۔

چہارم کا بیٹا تھا، یزدجرد نہایت ظالم اور سفاک تھا، اس کے لڑکے بھی اس کے ظلم وستم کا شکار تھے، بہرام کی پیدائش پر نجومیوں نے فال دیکھ کر یزدجرد کو آگاہ کیا کہ نومولود (بہرام گور) کی قسمت کا ستارہ چوں کہ بہرام فلک (یعنی آفتاب) ہے، لہٰذا احتیاطاً اس کی پرورش بیرونی ملک میں ہو تو بہتر ہے، چنانچہ یزدجرد نے بہرام کو عراق میں حیرہ کے والی منذر بن نعمان کے سپرد کردیا، بہرام کی تربیت کی خاطر دو عرب اور ایک ایرانی دایہ کا تقرر کیا گیا، لڑکپن ہی سے بہرام ہر میدان میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا، منذر نے بہرام کے لیے دو مضبوط قلعے بنام ''خورنق'' اور ''سدیر'' تعمیر کرائے۔

بہرام میں بچپن ہی سے بزرگی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے، اس نے سنِ بلوغ کو پہنچتے پہنچتے بیشتر علوم وفنون میں مہارت حاصل کرلی تھی، تیراندازی، شہ سواری اور شمشیر زنی میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا، اس کو جنگلی گدھوں (گور) کے شکار کا بہت شوق تھا، اس تعلق سے وہ بہرام گور کے لقب سے جانا جاتا ہے، بہرام جوان ہوکر اپنے باپ کے دربار میں حاضر ہوا لیکن یزدجرد نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی، وہ دوبارہ اپنے اتالیق کے پاس عراق لوٹ گیا، یہاں وہ عیش وعشرت، نغمہ وسرود اور عشق وعاشقی میں مشغول ہوگیا، ۴۲۰ء میں یزدجرد گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوگیا، ارکانِ دولت نے ایک نیک، شجیع اور رعایا پرور جانشین کی تلاش شروع کی، انہیں بہرام کی بہ نسبت ایرانی نژاد خسرو نامی شخص ایرانی تخت کے لیے موزوں نظر آیا، بہرام میں عربی صفات زیادہ تھیں، چنانچہ فریقین کے درمیان کشیدگی بڑھنے لگی اور جنگ کے آثار پیدا ہونے لگے، اسی دوران بہرام نے ارکانِ دولت کے سامنے ایک مدبرانہ تجویز رکھی۔

بہرام نے کہا کہ ''دو بھوکے اور خونخوار شیروں کے درمیان شاہی تاج رکھ دیا جائے اور اس کے دعوے داروں میں سے جو بھی اسے اٹھالائے گا وہ بادشاہت کا حق دار ہوگا''، چنانچہ اس خطرے کو مول لینے کی پیش کش پہلے بہرام نے کی، اس بات پر ارکان دولت راضی ہوگئے، ایک خلقت کے سامنے شاہی تاج دو شیروں کے درمیان رکھا گیا، بہرام آگے بڑھا اور شیروں کے نزدیک پہنچتے ہی اس نے ان کے کان پکڑے اور دونوں شیروں کے سروں کو ایک دوسرے سے اتنے زور سے ٹکرایا کہ ان کے بھیجے نکل پڑے، تماشائیوں نے بہرام کی بہادری کی واہ واہ کی اور

اس کی دلیری کا داد دی، بہرام نے شاہی تاج ارکان دولت کو پیش کیا، تاج کے دوسرے حق دار خسرو نے آگے بڑھ کر یہ تاج بہرام گور کو پہنایا اور بہرام کے بادشاہ ہونے کا اعلان کردیا، بہرام نے ۱۸ سال تک نہایت انصاف پسندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ حکومت کی، وہ ایک عاشق مزاج سیلانی طبع انسان تھا، اس کی عاشقانہ معرکہ آرائیوں کے پس منظر میں مختلف پلاٹوں کے ساتھ ایران اور ہندوستان میں کئی کہانیاں منظوم کی گئی ہیں، بہرام کا ہندوستان پہنچ کر شاہ شنگل[1] کی لڑکی سے شادی کرنا بھی مشہور ہے، محمد امین کی داستان ''بہرام گور وگل اندام'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، ان کہانیوں کو موثر اور دل چسپ بنانے کے لیے مافوق الفطرت عناصر کا اضافہ کیا گیا ہے، داستان میں Suspence پیدا کرنے کا یہ واحد ذریعہ تھا۔

ذیل میں بہرام گور سے منسوب داستانوں کی ایک فہرست دی جارہی ہے، اس فہرست سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ داستان مختلف زبانوں میں کس قدر مقبول تھی:

۱- داستان بہرام چوبین از فردوسی طوسی (شاہ نامہ)، ۲- بہرام در گنبدِ سیاہ از نظامی گنجوی (مثنوی ہفت پیکر) (ایک قصہ میں بہرام کی معشوقہ ہندوستانی ہے)، ۳- بہرام شوش: بہرام چوبین کا عربی ترجمہ، ۴- قصہ بہرام گور، داستان بہرام گور، احوال بہرام گور، ص ۱۳۰۷ از فہرست مشترک، احمد منزوی، ۵- بہرام گور و بانو حسن پری: فہرست نوشاہی ص ۶۷۳، ۶- بہرام گور و بانو حسن پری: ترجمہ فارسی از متن ترکی: مشترک فہرست ۶: ۱۰۷۹، ۷- بہرام گور و بہرام خارکش، ایوانوف: ۳۰۱/۴، ۸- بہرام گور و دلارام: پانچ نسخے، دیکھیے خاور شناسی اور فہرست اتھے: لندن، ۹- بہرام گور ولنبسک آبکش: داستان شاہ نامہ! فردوسی، ۱۰- بہرام نامہ: مشترک ۶: ۱۱۶۵، ۱۱- بہرام و بہروز؛ ۱۲- بہرام وزہرہ، ۱۳- بہرام وگلندام: (اکادمی علوم ایران نے اس داستان کو شایع کردیا ہے لیکن اس کی کہانی الگ ہے جس میں گلندام کی بے اعتنائی پر بہرام اسے قتل کردینے کا حکم صادر کردیتا ہے) نیمبر ۱۶۳۹، ملکہ گلندام اور داستان بہرام پسر باشاہِ روم کے عنوان سے اس داستان کے مختلف نسخے ملتے ہیں، (دیکھیے فہرست مشترک از احمد منزوی، ص ۳۱۸)، ۱۴- بہرام نرسی از ابن ندیم (عربی) سبک شناسی، ص ۱۵۵، ۱۵- بہروز و بہرام:

---

[1] تاریخی اعتبار سے یہ واقعہ قابل اعتنا نہیں ہے۔

فہرست مشترک از احمد منزوی، ص ۳۱۸ ، ۱۶- بہرام گور و دیو سفید : اس عنوان کے تحت ہندوستان میں کئی نثری داستانیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ملتی ہیں ، (دیکھیے فہرست مخطوطات فارسی : سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد) ، ۱۷- کاما اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی اور نوساری : گجرات کے کتب خانوں میں اس قصے کے متعدد مخطوطے دست یاب ہیں ۔

مثنوی بہرام وگل اندام از محمد امین سبزواری کے ایک درجن سے زیادہ مخطوطے روس، لندن اور ایران کے کتب خانوں میں دست یاب ہیں ، راقم نے ہندوستان کے بیشتر کتب خانوں کی فہرستیں دیکھی ہیں ، یہ فہرستیں بھی اس مثنوی کے نام ونمود سے عاری ہیں البتہ مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر، چرنی روڈ، ممبئی کے کتب خانے میں اس مثنوی کا ایک نامکمل مخطوطہ ہے، مثنوی کی فہرست میں اس کی تفصیلات درج نہیں تھیں ، راقم نے اس کے مطالعہ کے بعد ، اندرونی شہادتوں کی مدد سے اس مثنوی کے صحیح نام اور مصنف کی تصدیق کی ، امین سبزواری کی اسی مثنوی کا ایک مخطوطہ راقم کی ملکیت ہے ، اس میں ابتدائی اشعار ضایع ہوچکے ہیں ، لہذا گمان غالب ہے کہ امین سبزواری کی مثنوی "بہرام وگلند ام" کے صرف دو نسخے فی الوقت ہماری دانست میں ہیں جن کا تعلق ہندوستان سے ہے ، دیگر مخطوطات کی تفصیل ذیل میں درج کی جارہی ہے ۔

مثنوی بہرام وگلندام کے مخطوطے

۱- مثنوی بہرام وگلند ام: ۲۹۷۲ نسخہ ملک الشعرا بہار (مملوکہ)

۲- ایضاً: (الف): ریو، ۸۷۷، برٹش میوزیم لندن، مورخہ ۱۱۴۷ھ (؟)۔

(ب): —— ایوانو —— نمبر ۶۴۴ ص ۲۸۱ ۔

۳- ایضاً: نسخہ تفلیس ۸: ۱۸۸، نشریہ (گرجستان ، روس) ۔

۴- ایضاً: ایتھے ۱۶۹۷ مورخہ ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء (انڈیا آفس لندن) (۱)

۵- ایضاً: (باغ ارم) دانش گاہ پنجاب لاہور ، ۴/۷۴/۷۱/SPi/ ۴۲۷۴ (پروفیسر شیرانی نے اس کو محمد امین کی مثنوی بتایا ہے ، ۱۴۰ اگ : (عبداللہ ۲: ۵۲۸ ، بشیر حسین ، ۸۹/۱) [دراصل بنائی کی مثنوی بہرام و بہروز کا نام "باغ ارم" ہے] ۔

۶- بہرام وگلند ام: کتب خانہ گنج بخش : اسلام آباد ۱۰۸۸۶، تحریر پختہ ۱۲، ۱۳/۱۲ھ ۔

۷- ایضاً: کتب خانہ گنج بخش : اسلام آباد : ۲۹۱۲ نستعلیق خام ج ۲/ ۱۲۷۷ھ ، (۳۸۷ ص : (گنج ۳: ۱۵۵۳) ۔

۸- ایضاً: پشاور، پشتو اکاڈمی : ۲۱۴، ۶۲ ص (استاد محمد رضا ہمدانی) ۔

۹- ایضاً: قاہرہ یونیورسٹی مصر ، (ابتدا : ابتدا کردم بنام آن الہی) از کاتبی [کسی تسامح کے باعث بنائی کی یہ مثنوی کاتبی کے نام سے منسوب ہوگئی ہے ، کاتبی کے نام سے ایسی کسی مثنوی کا پتہ نہیں چلتا) ۔

۱۰- ایضاً: کتب خانہ مجلس ایران ، نمبر ۲۶۱۶-۸-۳۵۸ ، از فہرست نگار [فخری رستگار] ۔

۱۱- ایضاً: کتب خانہ حاج حسین ملک ، نمبر ۴۵۸۷ ، ایران ، فہرست مخطوطات : ج ۲ ، ص ۶۴ ۔

۱۲- ایضاً: کتب خانہ حاج حسین نخجوانی ، سدہ ۱۱-۱۲- ش ۱۷۳۶ ، فہرست نسخہ ہای خطی ، ۲۳۸ ، ایرج افشار ۔

۱۳- ایضاً: مخزونہ راقم ، پہلے چند صفحات ندارد ، جلد کے دوران صفحات کی غلطی جلد بندی ، کاغذ قدیم ، صفحات ۱۰۲ ، ترقیمہ ، تمام شدہ کتاب "بہرام گلندام" ۲۲ / رجب المرجب ۱۰۷۱ھ ، در بندر مبارک سورت کاتب خواجہ محمد رضا ہرمزی (قدیم ترین) ۔

۱۴- ایضاً: مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر ، لائبریری ، چرنی روڈ ، ممبئی ۔

۱۵- ایضاً: عرصہ ہوا ایران میں یہ مثنوی کسی مخطوطے کی بنیاد پر شایع ہوچکی ہے ، ایران کے کتب خانوں میں اس کے نسخے موجود ہیں ، اس میں کوئی تعارف یا مقدمہ نہیں ہے ۔

۱۶- ایضاً (الف): مخطوطہ نمبر ۲۶۱۹ ، فہرست مرتبہ احمد منزوی ، یہ مثنوی غلطی سے

کلیات کاتبی کے ساتھ منسلک ہے، کاتبی کا نام بھی محمد تھا لہذا یہ سہوا ہے، اس کے ۱۶۸ ابیات میں مقدمہ ہے۔

آغاز چو سلطاں گوش بر تدبیر او داد
ہزاراں آفریں بر آن نکو کرد

انجام زیاد مرگ ایشاں را خبر نیست
حکایت را بپایاں بسر نیست
بکردم نام در دفتر مجدد
امین الدین لقب نام محمد

۱۶-(ب): مثنوی بہرام وگلندام کو سہواً کسی "صافی" تخلص رکھنے والے شاعر سے بھی منسوب کردیا گیا ہے حالاں کہ لفظ صافی تخلص کے معنوں میں نہیں آیا ہے، یہ تمام اشعار امین کی مثنوی ہی سے ماخوذ ہیں، یہ تسامح ذیل کے خط کشیدہ شعر سے ہوا ہے، حالاں کہ اس کے بعد والا شعر وہی ہے جو امین الدین امین نے اپنے نام کی وضاحت میں قلم بند کیا ہے:

نوشتہ بود بر طاق زبرجد   مدیح شاہ شمس الدین محمد
اگر باشد زصافی ایں حکایت   بہ معنی شان بود عین عنایت
بکردم نام در دفتر مجدد   امین الدین لقب نام محمد

۱۷-ایضاً: مخطوطہ نمبر ۲۶۱۷، فہرست مرتبہ از احمد منزوی شمارہ دفتر ۵۰۶۶۴، یہ مخطوطہ ابتدا میں مکمل ہے اس میں ۲۳۵۰ ابیات ہیں، ناقص الآخر ہے۔

آغاز بملک روم شاہی بود باداد - درایامش دل اہل جہاں شاد
انجام بتاریخ عرب گشتہ مشہور - کہ شد از کعبہ ختم روی دور

راقم کے مخطوطے یہ مصرعہ یوں ہے (کہ شد از مکہ اعظم نبی دور (مخطوطہ)۔

ذیل میں مثنوی بہرام وگل اندام از محمد امین سبزواری کے قدیم ترین مخطوطے کا تعارف کرایا جاتا ہے مگر اس سے قبل کہ مثنوی بہرام وگل اندام از محمد امین کے قدیم ترین مخطوطے پر روشنی ڈالی جائے، ہمیں ایک مغالطہ کو دور کرنا ہوگا۔

مرزا محمد تقی بہار کی تحویل میں مثنوی "بہرام وگل اندام" کا ایک مخطوطہ تھا، خانم رستگار نے اپنی مرتب کردہ فہرست (مجلس ۸: ۳۵۸) میں درج کیا ہے کہ بہ قول بہار "اس مثنوی کا مصنف امین الدین محمد صافی" ہے، وہ بھی سبزوار کا باشندہ ہے اور صافی نے کرمان وفارس کے بادشاہ "شمس الدین محمد" کی اس مثنوی میں مدح کی ہے، بہار مرحوم کے اس بیان میں کہیں کاتبی ترشیزی کا حوالہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی تذکرہ میں اس قسم کا کوئی حوالہ موجود ہے کہ کاتبی نے کرمان وفارسی کے بادشاہ "شمس الدین محمد" کو سراہا ہے، فہرست مشترک (پاکستان) اور ذریعہ کے فہرست نگار نے اس مثنوی کو سہواً کاتبی کے نام سے منسوب کردیا ہے، کاتبی کی کسی مثنوی کا نام "بہرام وگل اندام" نہیں ہے، دراصل یہ مثنوی بنائی کی ہے جو کسی تسامح کے باعث کاتبی کے نام سے مشہور ہوگئی ہے، "ابتدا کردم بنام آن الٰھی"، قاہرہ یونیورسٹی مصر میں بنائی کی مثنوی کا مخطوطہ بنام بہرام و گل اندام محفوظ ہے جس کا آغاز مندرجہ بالا مصرعہ سے ہوتا ہے، مثنوی بہرام وگل اندام از محمد امین کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے ~

الٰہی ای جناب داد و بینش   ز تو پرنور چشم آفرینش
بباشد مدح تو برمن کنوں فرض   کنم نمالا بہ پیش راہ تو عرض

(نقل از نسخہ گنج بخش، اسلام آباد پاکستان)۔

جناب عارف نوشاہی اور احمد منزوی نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ کاتبی مثنوی "بہرام وگل اندام" کا مصنف نہیں ہے، (ملاحظہ ہو فہرست مشترک: پاکستان ص ۱۳۹۶)۔

راقم نے ایران اور انگلستان کی مخطوطات کی فہرستوں کا مطالعہ کیا ہے، ایران کے کتب خانوں میں اس مثنوی کے مخطوطے بھی دیکھے ہیں لیکن ان میں کہیں بھی اس مثنوی کے مصنف کا نام یا تخلص "صافی" نہیں دیکھا، یقیناً کسی تسامح یا تحقیقی غلط فہمی کے باعث یہ غلط بیانی راہ پاگئی ہے، البتہ مرحوم پروفیسر محمود شیرانی نے دانش گاہ پنجاب لاہور کی فہرست مخطوطات (VI/SP/۴۷۶) میں اس

مثنوی کو "باغ ارم" کے نام سے متعارف کیا ہے۔

مثنوی بہرام وگل اندام از محمد امین کا مخطوطہ جو راقم کا مخزونہ ہے، ترقیمہ کے اعتبار سے کافی قدیم ہے، اس کے ابتدائی ۱۶۹ اشعار ندارد ہیں، ذیل میں اس کا مکمل تعارف پیش ہے:

سائز:-8×5، کاغذ:-قدیم غالباً دولت آبادی، حالت:-بوسیدہ، آب زدہ، شیرازہ بند نہیں ہے، خط:-نستعلیق، صفحات:-۱۰۲، تعداد اشعار:-۲۳۵۰، ابتدا:-کتاب بہرام گل اندام، بسم اللہ الرحمن الرحیم:- بنام نقش بند آدم از خاک - برافرازندۂ ایوان افلاک، گم شدہ اشعار کی تعداد:-۶۹، (پہلا صفحہ کسی دوسرے نے نقل کیا ہے)۔

ترقیمہ:- تمت الکتاب بعون الملک الوہاب تمام شدہ، کتاب بہرام گل اندام، در تاریخ ۲۲ رجب المرجب ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۰ء در بندر مبارک، سورت، کاتب والعبد اقل ہم مال کم ترین خلق آمد، خواجہ محمد رضا ہرمزی۔

روایتی مثنویوں کی طرح اس مثنوی کا آغاز حمد سے ہوتا ہے، اس کے بعد نعت اور منقبت ہے، سبب تالیف کتاب کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔

زیر نظر مخطوطے کا آغاز نسخہ گنج بخش، اسلام آباد پاکستان کے مطابق ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے ؎

الٰہی ای جناب داد و بینش ز تو پر نور چشم آفرینش

بیا شد مدحِ تو بر من کنون فرض کنم حالا بہ پیش راہِ تو عرض

اس کے بعد ۱۶۹ اشعار ندارد ہیں......اور ذیل کے اشعار سے مثنوی شروع ہوتی ہے

نوشتہ بود بر طاقِ زبرجد ز مدحِ شاہ شمس الدین سرمد

(۲) کتب خانہ تفلیس روس کے نسخے کا آغاز ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے، مثنوی کی ابتدا بھی اسی شعر سے ہوئی ہوگی

ز بسم اللہ بگشودم درِ راز ثنا و مدحِ بیچوں کردم آغاز

خداوندی کہ از جسم و عرض دور کہ نامش جسم و جان را ساخت معمور

(۳) برٹش میوزیم، لندن والا مخطوطہ بھی مکمل نہیں ہے کیوں کہ اس کی ابتدا ذیل کے

شعر سے ہوتی ہے ؎

بنام نخل بندِ روضۂ جان و صفش کرد فکرم را گلستان

امین سبزواری کے حالات مثنوی بہرام وگل اندام کے خاتمہ پر امین نے "درخاتمۃ الکتاب" کے عنوان سے ۲۷ اشعار نظم کیے ہیں، ان اشعار میں انہوں نے اپنے نام، لقب، تخلص اور وطن مالوف سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں، امین نے مثنوی کی تاریخ تصنیف بھی کہی ہے اور اسی میں اشارتاً کہا کہ اس میں "میم" کا تعمیہ ہے یعنی اگر تاریخ تصنیف سے "میم" کے اعداد وضع کر دیے جائیں تو امین کا سال ولادت نکل آتا ہے۔

مثنوی کے مصنف کا نام محمد، امین الدین لقب اور امین تخلص تھا، چنانچہ اس کی صراحت ذیل کے شعر میں کی ہے ؎

بنام نامہ بر دفتر مجرد امین الدین لقب، اسمم محمد

تخلص شد ازیں معنی امینم کہ در دل، گنج معنی شد یقینم

ایران کے صوبہ خراسان کے شہر طوس کے قریب منخق نامی مقام تھا، چنانچہ کہتے ہیں ؎

بدانستی چو از اشعارِ نامم خراسان است دو عالم مطنم

دراصل امین کا تعلق فردوسی کے وطن طوس سے تھا اور وہ لا ماد منخق میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے کہتے ہیں ؎

اگرچہ اصلم از طوس است مشتق بود مولودم از لا مادِ منخق [1]

امین نے مثنوی کے سال تصنیف اور اپنے سال ولادت کی طرف ذیل کے شعر میں وضاحت کی ہے، ملاحظہ کیجیے:-

فزوں از ششصد و باسین و جیمت ز سالِ عمرِ من بہ گذشتہ میمت

شش صد + س + ج + ت = ۱۰۶۳ھ تاریخ تکمیلِ مثنوی ۱۶۵۲ء

۶۰۰ + ۶۰ + ۳ + ۴۰۰ میم ۴۰- ، ۴۰-

۱۰۲۳ھ/۱۶۱۳ء امین کا سال ولادت

ظاہر ہے کہ مثنوی کی تکمیل کے وقت محمد امین الدین امین کی عمر ۴۰ برس کی تھی۔

---

[1] سبزوار کے قریب منخق نامی ناحیہ کا پتہ چلتا ہے۔

امین نے مثنوی کی تمہید میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ وہ کرمان (فارس) کے امیر شمس الدین محمد کے دربار سے وابستہ تھے، امیر شمس الدین بہ قول امین ایک عادل، منجم اور ماہر فنون شخص تھا، اس کے کارناموں کے قصیدے طاق زبرجد پر کندہ تھے اور اسی کی فرمائش پر امین نے یہ مثنوی تصنیف کی تھی، حالاں کہ ان کا منشا کچھ اور تھا وہ دراصل اپنے کام اور نام ونمود کو زندۂ جاوید بنانے کے خواہاں تھے، شہرت کی غرض سے امین نے عوام پسند قصہ ''بہرام وگل اندام'' کو منظوم کیا، چنانچہ کہتے ہیں ؎

کہ کرمان را امیری بود عاقل   منجم ، عادل ، پرفن ، کامل
بُدی در فارس او را جای و ماوای   شدہ مشہور آفاق آن نکو رای
نوشتہ بود بر طاقِ ز بر جد   مدیحِ شاہِ شمس الدین محمد

افسوس ہے کہ امین کے بارے میں اس سے زیادہ معلومات فراہم نہیں ہیں، فارسی تذکرے بھی ان کے بارے میں خاموش ہیں، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ رہتی دنیا تک اپنا نام ونشان باقی رکھنا چاہتے تھے، اسی غرض سے انہوں نے خاص طرز میں ''قصہ بہرام وگل اندام'' کو شعری جامہ پہنایا تھا، لہذا کہتے ہیں ؎

ہزاراں سال شد کز عہد بہرام   کہ بودی عاشق رویِ گل اندام
تو می دانی دلا تحقیق ایں کار   کہ شہرت می دہم ایں دم با شعار
بعالم ماند تا محشر مرا نام   بطرزِ خاصِ بہرام و گل اندام

قصہ کا خلاصہ: امین سبزواری نے مثنوی کی تمہید میں اس امر کی صراحت کردی ہے کہ اس کہانی کے تانے بانے اس کو خواب میں ہاتھ آئے اور اس نے اس پلاٹ کو منظوم کیا، امین نے مثنوی کے نام کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے ؎

چو کردم ایں سخن آغاز و اتمام   نہادم نام ''بہرام و گل اندام''

امین کی مثنوی کا آغاز روایتی مثنویوں کی طرح ہے، شعر وسخن کی توصیف اور افادیت کی تشریح کے بعد امین نے قصہ کی ابتدا کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس قصہ کا تعلق فاتح غازی محمود غزنوی سے ہے، محمود غزنوی ایک ایسا محل تعمیر کرانا چاہتا تھا جس سے اس کا نام امر ہوجائے، غزنوی کے

محبوب نظر ایاز نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ کسی سخن ور کو مدعو کرے اور اس سے ایسی کتاب لکھنے کی فرمائش کرائے جس سے اس کا نام زندۂ جاوید ہوجائے، چنانچہ اس نے فردوسی کو یاد کیا اور اس سے شاہنامہ جیسے شاہ کار کو نظم کرنے کی استدعا کی، لہذا امین نے بھی اسی کی پیروی میں بہرام وگل اندام کے قصہ کو منظوم کیا، قصہ کا آغاز کرتے ہوئے امین لکھتا ہے کہ: روم کے بادشاہ کا کوئی نرینہ وارث نہیں تھا، لہذا وہ بہت غمگین رہتا تھا، خدا کے فضل وکرم اور بزرگوں کی دعاؤں سے اس کے یہاں نرینہ اولاد پیدا ہوئی تمام رعایا بہت خوش ہوئی، انہوں نے جشن منایا، بادشاہ نے قیدیوں کو آزاد کیا، نومولود کا مبارک نام ''بہرام'' رکھا گیا، چار سال کی عمر میں بہرام کو مکتب میں داخل کردیا گیا، دس سال کی عمر میں بہرام نے متعدد علوم وفنون پر دسترس حاصل کرلی، بہرام کو گھوڑ اسواری، تیراندازی اور سیر وشکار سے بے انتہا رغبت تھی، جسمانی ورزش نے بہرام کو طاقت ور پہلوان بنادیا تھا، وہ ایک دن اپنے باپ کے ہم راہ شاہی محل آیا، امرائے دولت کی مجلس میں شریک ہوا، یزدجرد ظالم نے بہرام کو اس مجلس میں سات نصیحتیں کیں ؎

بخواہم گفت پندت ہفت موزوں   بخوبی ہر یکی دری ست مکنوں

دوسری طرف فغفورِ چین نے عدل وانصاف سے چین میں امن وامان قائم کررکھا تھا، اس کی شجاعت اور جنگ جوئی کے چرچے عام تھے، اس کی ایک حسین وجمیل لڑکی تھی، اسی کا نام ''گل اندام'' تھا، وہ اسم بامسمیٰ تھی، اس کے حسن کے ہزاروں دیوانے تھے، اس کی خوبصورتی کے چرچے بہرام تک پہنچے۔

بہرام نے سیر وشکار کے لیے اپنے باپ سے اجازت لی اور جنگل کی طرف نکل پڑا، اسے ایک سنہرا گور (جنگلی گدھا) دکھائی دیا (دراصل یہ گدھا نہیں بلکہ دیوزاد تھا)، اسی وقت ایک خونخوار شیر نے بھی بہرام پر حملہ کیا، بہرام نے شیر کو ڈھیر کردیا لیکن ایسا کرنے میں وہ اپنے محافظوں سے بچھڑ گیا، دور پہاڑ کی چوٹی پر اسے قلعہ نظر آیا، قلعہ پر پہنچا تو تکان کے مارے وہیں سوگیا، خواب میں ایک پیر مرد اس کے قریب آیا اور اس نے بہرام کو ''گل اندام'' کا پتہ بتادیا، بہرام چین کی طرف چل دیا، راستہ میں اس کو مشکلیں پیش آئیں، اس کو دیوزادوں اور عفریتوں سے نبرد آزمائی کرنی پڑی، انہیں قابو میں کرنا پڑا، بہرام کو ہر محاذ پر دیوزادوں کی مدد سے کامیابی

نصیب ہوئی، وہ شادماں وکامران ہوتا ہے، بالآخر بہرام اپنے دشمنوں کو شکست فاش دے کر اپنی محبوبہ "گل اندام" کو حاصل کرلیتا ہے اور بڑے تزک واحتشام کے ساتھ اپنے وطن روم کو لوٹتا ہے، بہرام کے ضعیف ماں، باپ، امرا اور اکابر کے ہم راہ اس کے استقبال کو پہنچتے ہیں، بہرام گور عدل گستری کے ساتھ سالہا سال حکومت کرتا ہے البتہ اس کی موت کیسے واقع ہوتی ہے اس کا کسی کو علم نہیں ہے، (مخطوطہ نمبر ۷۹۴ ابنام بہرام وگل اندام / باغ ارم، فہرست مشترک، پاکستان از احمد منزوی، ص ۱۳۹۶)۔

داستان کے منتخبہ اشعار اور تفصیلی قصہ

شاہ روم کے یہاں نرینہ اولاد کے سوا سب کچھ موجود تھا بادشاہ نے پیر فقیر، غربا اور قیدیوں کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کیا، لہٰذا ان لوگوں کی دعائیں شاہِ روم کے حق میں قبول ہوئیں اور اس کے حرم میں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نجومیوں اور بادشاہ نے "بہرام" نام تجویز کیا ؂

چنیں گفت پیر دیدہ ایام — کہ کشور کرد او را نام بہرام

بہرام کی پرورش ایک عقل مند دایہ کے ہاتھوں ہوئی، چار سال کی عمر میں اسے ایک باہنر شخص کی نگرانی میں دے دیا گیا، بہرام نے بہت جلد مکتب کے سمندر سے سارے گوہر چن لیے، جب وہ چھ سال کا ہوا تو اسے ایک کامل استاد کے سپرد کیا گیا، بہرام نے تمام مروجہ علوم وفنون میں مہارت حاصل کرلی، وہ فن سپاہ گری، شمشیر زنی اور تیر اندازی میں طاق ہوگیا، سیر وشکار کے تمام ہنر سیکھ لیے، شاہ روم کو بہرام کی روز افزوں ہنر آموزی اور بہادری کے کارناموں کی تفصیل ملتی رہی۔

کشورِ روم کا ایک عالی شان فلک بوس محل تھا، ایک دن بادشاہ نے محل میں مجلس آراستہ کی، بہرام نے بھی اس قصر میں حاضری دی ؂

بہ قصر آمد خراماں آن نکو نام — روانہ شد از قفا شہزادہ بہرام

شاہی محفل گلفام ساقی اور شراب وکباب سے آراستہ تھی، شاہ روم، بہرام کو محفل میں دیکھ کر خوش تھا، رقص وسرود سے خمار مے میں اضافہ ہورہا تھا، بہرام نے حسب ماحول شاہِ روم کی توصیف میں غزل پیش کی ؂

بوصفِ شاہ وز معنوی سُفت — بوصف الحال مجلس ایں غزل گفت

غزلِ بہرام از ایں

بدولت باد جامِ بادہ ات نوش — عروس مملکت دائم در آغوش
صدائے مطرب و بزمت چنان باد — کزان بلبل شود در باغ مدہوش
کلاہ سروری پیوستہ بر فرق — قبای سلطنت ہموارہ بردوش
بود چندان فرح در بزمِ خاصت — کہ غم از خاطرت گردد فراموش
ندیمان و وزیرانِ خرد مند — حریفان و ظریفان قصب پوش

بہرام کی زبانی غزل سن کر شاہ روم خوش ہوا، اس نے بہرام کو عوام کی خوش نودی اور ایک کامیاب بادشاہ ہونے کے لیے سات نصیحتیں کیں، جن کا مختصر خلاصہ ذیل میں درج ہے:۔

پند اول:- اس میں شاہ روم نے بہرام کو عدل گستری، شیریں بیانی، رعیت پروری، رعایا کی خوش حالی، یتیموں کی خبر گیری اور ظلم وتعدی نہ کرنے کی ہدایت دی۔

پند دوم:- بہرام ہمیشہ عقل وہوش کے دروازے کھلے رکھے اور کانوں کی کھڑکیاں بند نہ کرے، دنیا میں شمشیر زنی کی دھاک بٹھا کر کے دشمنوں کو زیر کرے، نازک موقعوں پر حلم وفراست کا استعمال ضروری ہے، خطرناک دشمن کو قتل کردے اور کبھی کبھی بخشش کا مظاہرہ بھی کرے۔

پند سوم:- بہرام ہمیشہ صبر وضبط سے کام لے، جلد بازی نہ کرے، مغرور نہ بنے، ہمیشہ کمربستہ رہے، دشمن سے غافل نہ رہے، تلوار اور گھوڑے کی نگاہ داری کرے۔

پند چہارم:- بہرام ہمیشہ سوجھ بوجھ سے کام لے، ہر بات میں اندیشہ ضروری ہے، احتیاط اور درمیانہ روی اختیار کرے، اس سے مظلوم پر زیادتی نہیں ہوتی۔

پند پنجم:- شاہِ روم بہرام کو تنبیہ کرتا ہے کہ ہر کس وناکس کو مجلس میں راہ نہ دے، اس میں انتخاب ضروری ہے، نیک وبد کی پہچان لازمی ہے، نااہلوں اور کوتاہ عقل والوں سے پرہیز کرے ؂

اگر دول پرور باشد شعارت — پسندیدہ نباشد کارو بارت

ذی ہوش دوستوں کو ساتھ رکھنا ضروری ہے، ہنر مندوں اور عقل مندوں سے مجلس آراستہ رہے تو بہتر ہے ؂

مصاحب عاقل و فرزانہ باید نہ دون و جاہل و دیوانہ باید

حکیموں کو اپنا مونس بنائے اور عارفوں کے ساتھ زندگی بسر کرے تاکہ سعادت نصیب ہو۔

انیس خویشتن عارف گزیں کن حدیثم نقش بر روی نگیں کن

پند ششم :- اے میرے بیٹے! سخاوت سے کام لے تاکہ خواری نہ ہو، بخشش کو شعار بنا تاکہ لوگ تیری تعریف کریں، حالاں کہ حاتم بت پرست تھا مگر جود و سخا کے باعث جنت کا حق دار ہے"

اگرچہ بت پرستی بود حاتم سخا چوں داشت نبود در جہنم

بخیل دین و دنیا کھو دیتا ہے، سخاوت انسان کو جاوداں کر دیتی ہے، مال و دولت اور خزانے کی حفاظت کرنا ضروری ہے، وقتِ ضرورت کام آتا ہے، فضول خرچی ہرگز نہ کر۔

پند ہفتم :- شاہ روم کی آخری نصیحت یہ ہے کہ "اے شہزادے! غصہ بری چیز ہے، ہمیشہ عفو سے کام لے، یہ عقل مندی کی نشانی ہے، اسیروں پر رحم کر اور انہیں سزا کے بعد رہا کر دے، کمزوروں پر ظلم نہ کر، آتشِ قہر پر قابو رکھ، اس کو بھڑکنے سے پہلے ٹھنڈا کر دے"۔

تو عفو کن ہر گناہ اہل علم کہ تا یزداں کند رحمت ترا ہم

بہرام نے اپنے باپ کی نصیحتیں بہ غور سنیں اور انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیا، اس کے بعد شاہ روم نے بہرام کی تاج پوشی کی، عربی نسل کا گھوڑا انعام میں دیا، اس گھوڑے کی عمدہ خصوصیات کی بنا پر بہرام نے اس کا نام "جہاں پیما" رکھا۔

یہاں سے چین کے بادشاہ اور اس کی حسین و جمیل بیٹی کا ذکر شروع ہوتا ہے جس کی بابت بہرام نے کئی کئی قصے سن رکھے تھے۔

فغفور چین کا سکہ چین کی سرحد سے بلغار تک رائج تھا، اس کی ایک لڑکی مشتری یا رے کی طرح تھی اور چاند اس سے نور مستعار لیتا تھا، شہزادی کو سیر سپاٹے کا شوق تھا، ایک مرتبہ اس نے خوبصورت مرغ زار میں خیمہ نصب کیا اور وہاں سیر کرنے لگی، اس کے حسن کے جادو سے ہزاروں فتنے برپا ہوئے اور اس کی زلفوں کے دام میں ہزاروں عاشق گرفتار ہو گئے۔

پھول جیسا جسم رکھنے والی شہزادی کا نام "گل اندام" رکھا گیا تھا۔

رخ و زلفش نشانِ کفر و اسلام بت زاہد فریب آمش گل اندام

امین سبزواری نے گل اندام کا سراپا پیش کرنے میں اپنے کمال فن کا سارا زور لگا دیا، ان کی ساری مثنوی کا سب سے جاذب نظر اور پرکشش حصہ بھی یہی ہے، گل اندام کے سراپے کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "شہزادی گل اندام کے لب شراب سے لبریز پیانوں سے کم نہ تھے اور اس کے سرخ و شنگ رخسار پر عنبریں تل جگمگاتا تھا، اس کے پرکشش چہرے پر ابھرنے والے حسن کے کرشمے، نگارستانِ چین سے کم نہ تھے، اگر مانی جیسے نقاش کو اس کا نقش بنانے کا موقع ملے تو گل اندام کے حسن کی آتش رشک مانی کے قلم (یعنی برش) کو جلا کر راکھ کر دے گی، اس کی کمر خط سے بھی باریک ہے لہذا اس کے زیر و بم کا اندازہ لگانا مشکل ہے، گل اندام کا منہ موم کی طرح نرم اور مہین ہے، اس کا بدن پیچ و خم کے ایک شکنجہ کے مانند ہے، ارم کے بوستان کا سرو اس کے قد کے سامنے ہیچ ہے، اس کی ابروؤں کے نیچے پُرفن آنکھیں ایسی ہیں جیسے دو ہندو زادے کسی بت کدے کے محراب میں بیٹھے ہوں، اس کے لب لعلیں عقیق کی مانند ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے حضرت خضر چشمۂ حیواں کے کنارے فروکش ہوں، اس کے چہرے کا جمال اور ابروؤں کا اتصال ایسے ہے جیسے ہلال کا اس کے ماتھے پر بسیرا ہو، اگر غلطی سے بھی فرہاد اس کی تصویر دیکھ لے تو شیریں کو فراموش کر جائے اور اگر خسرو اس کے لب لعلیں چھو لے تو وہ اپنی محبوبہ کا نام لینا ترک کر دے۔

گل اندام کے حسن و جمال کی خاطر عاشقوں کا ایک ہجوم اس کے فراق میں بدحال تھا مگر شہزادی کو اس کی خبر نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس طرف توجہ کرتی تھی، ہر عاشق نے اپنے عشق کے اظہار کی خاطر "گنبد فیروزہ" تعمیر کرایا تھا اور اس میں گل اندام کی تصویر آویزاں کی تھی، وہ عاشق ہمہ وقت اس کے دیدار میں مگن رہتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس وادی میں جا بجا گنبد تعمیر ہو گئے تھے، اس طرح گل اندام کے چرچے زبان زد عام و خاص تھے، بہرام نے بھی اس کی تعریف سنی

حکایت ہای آن ماہِ گل اندام زہر کس می شنیدی شاہ بہرام

گل اندام کے حسن کی تعریف لامحدود ہو گئی تھی، حتیٰ کہ اس کے حسن کے رشک کے مارے دیر و کنشت میں کفار نے ہزاروں چینی بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔

ز رشک حسن او در دیر کفار بشکستندی بتجین بتان فرخار

گل اندام نے ایک درخشاں قصر معلا تعمیر کروایا تھا اور اس محل کے جھروکے سے ہر عید کے دن عاشقوں کو اپنا دیدار بخشتی تھی ~

یکی قصر معلا داشت درخشاں کشادہ غرفہ را بر روی میدانٔ

ہر عیدی در آن بر کشادی جمال خود بہردم عرضہ دادی

جو بھی اس راہ سے گذرتا شہزادی گل اندام کا نظارہ کرتا جاتا تھا، وہ بہ یک نظر شہزادی کا والہ وشیدا ہو جاتا تھا اور اس کی حالت لالہ وگل کی طرح دریدہ ہو جاتی تھی ~

چو لالہ دامنش در خون کشیدی چو گل صد جای پیراہن دریدی

یہاں سے اس قصہ کو پہلی کڑی سے جوڑ دیتے ہیں۔

شاہی جشن میں شرکت اور اپنے باپ کی پند ونصائح کو گوش گذار کرنے کے بعد بہرام نے اپنے باپ سے شکار پر جانے کی اجازت چاہی، نظامی گنجوی کے حوالے سے بہرام نے اپنے باپ کو جواب دیا کہ سیر وشکار سے زندگی کا درخت تناور اور مضبوط ہوتا ہے اور نخچیر بانی میں درویشی کی کلید پوشیدہ ہے یعنی شکاری میں فقر وفاقہ اور مصایب سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، بادشاہ نے مدبر بہرام کی گفتگو سن کر اسے شکار پر جانے کی اجازت دے دی، بہرام اپنے گھوڑے ''جہاں پیا'' پر سوار ہو کر ہوا سے باتیں کرنے لگا، رعایا نے خوش ہو کر بہرام کو الوداع کہا اور نقارے بجائے ~

جہاں • پیای چو شہ شد سوارہ صدا برخاست از کوس و نقارہ

بہرام کے ساتھ دو سو سے زیادہ محافظ، خدمت گار کیل کانٹے سے لیس تھے ~

دو صد ترک ، خدنگ انداز سرکش ہمہ با گرز و با شمشیر و ترکش

بہرام جہاں پیا کو جنگلوں میں سرپٹ دوڑاتا چلا گیا، اتنے میں گرد وغبار کے ساتھ ایک ہولناک آندھی آئی اور بہرام کے روبہ رو ایک دھاڑتا ہوا خوف ناک شیر نمودار ہوا، شیر کو مقابل پا کر بہرام نے للکارا ~

چوں شاہ شیر دل بر شیر را دید پلنگ آسا دراں ساعت بغرید

بہرام نے چاچی کمان کھینچی اور اپنا تیر نشانے پر چھوڑا، شیر وہیں ڈھیر ہو گیا اسی اثنا میں یزداں کے حکم سے بیاباں سے ایک ہرن نمودار ہوا، بہرام اس کا پیچھا کرتے ہوئے فوجی محافظ دستے سے بچھڑ گیا اور جھلستی ہوئی وادی میں چھ روز تک بھٹکتا رہا، بہرام گور سے منسوب داستانوں میں یہ ہرن کبھی سنہرا اور کبھی گور یعنی جنگلی گدھے کی شکل میں دکھایا گیا ہے فی الحقیقت یہ سفید دیو ہے جو ان جانوروں کے روپ میں بہرام گور کو رجھانے آتا ہے، دراصل یہ مافوق الفطرت کردار داستان کو طول دینے کی غرض سے لایا جاتا ہے، ہندوستانی دیو مالائی کہانیاں بھی اسی وضع کی ہیں، رام جی بھی سیتا جی کے اصرار پر سنہرے ہرن (اصل میں ماریچ نامی دیوزاد) کا پیچھا کرتے ہوئے بہت دور چلے گئے تھے، ادھر راون نے سیتا جی کا اغوا کر لیا تھا ~

دران وادی بگرمای جگر سوز ہمی گردید آن ، خورشید شش روز

ساتویں روز بہرام کو دور سے ایک سبز رنگ کا گنبد دکھائی دیا ~

نگہ چوں کرد سلطان از دور معلّی گنبدی را دید پر نور

بلند و خوش چوں ایوانِ زبرجد بسانِ قبۂ اخضر ممرد

بہرام تکان کے مارے نڈھال تھا، جہاں پیا کو سائے میں باندھ کر ستانے لگا اور گہری نیند سو گیا، جب اس کی آنکھ کھلی تو ایک بزرگ شخص کو اپنے قریب پایا جو اس کی آنکھوں میں عرقِ گلاب ڈال رہے تھے ~

سرِ او در کنارِ خویش بنہاد گلاب اشک دیدہ را ، از دیدہ بکشاد

بہرام نے اس بزرگ سے ویرانے میں قیام کرنے کی وجہ دریافت کی، بزرگ نے کہا کہ یہ قصہ طولانی ہے اور اس میں کئی راز پوشیدہ ہیں ~

چہ گویم قصہ من ، بس دراز است دریں احوالِ من بسیار راز است

بزرگ نے کہا کہ وہ ہرگز مردہ دل نہیں ہیں، ان کا تعلق ترکستان سے متمول گھرانے سے ہے، وہ بھی اسی گل اندام کے عشق میں گرفتار ہو کر یہاں پر آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں اور جب تک انہیں اپنی منزل نہیں ملے گی انہیں لمحہ بھر بھی آرام نصیب نہیں ہوگا ~

کہ تا در بر نگیرم آن دلآرام نگیرم در جہاں یک لحہ آرام

بہرام کو اس عاشق زار پر رحم آیا، دوسرے روز بہرام گل اندام کی کھوج میں اس بزرگ کے بتائے ہوئے راستے پر چین کی جانب روانہ ہوگیا ~

همان شب بود آنجا شاه بهرام سحر گه در غمِ روی گل اندام

راستے میں بہرام نے ایک غزل کہی، جس میں خطرات سے کھیل جانے کا دعوی کیا ~

بگو ای باد ، با کشور که در غم بچین ، از بهر آن ، دلدار رفتم

سفر میں بہرام کا گذر ایک قلعہ کے قریب سے ہوا جو دیوزادوں کی آماج گاہ تھا وہاں رستم صفت چھ دیو اپنی بہن سمنبو کے ہم راہ رہتے تھے، وہ ہر روز شکار پر جاتے اور شام کو واپس آجاتے، ان کے نام صیفور، شماس، قیطور، حمطال، جمیطا اور افیوش تھے۔

ایک سایہ دار درخت کے نیچے بہرام لیٹ گیا، سمنبو نے بہرام کو کسی طرح دیکھ لیا اور اسے خطرے سے فوراً آگاہ کردیا، تھوڑی دیر بعد ایک خالی مکان سے وہ چھ خونخوار دیوزاد نکل آئے اور بہرام پر حملہ آور ہوئے، بہرام نے آن کی آن میں ان سبھوں کو پچھاڑ دیا اور ان کی مشکیں کس دیں، بہرام نے انہیں قتل کرنے کا عزم کیا، اتنے میں سمنبو نے بہرام کو کی گئی سات نصیحتیں یاد دلائیں جس میں بہرام کو رحم اور عفو کرنے کی ترغیب دی گئی تھی، اس وقت سمنبو پری وہاں موجود تھی۔

دران روزی که سلطاں خرد مند ترا میداد در ایوانِ سرا پند

بمنظر ایستاده بودم از دور دو چشم برشه و از خلق مشهور .

گفت رحم، کن بر زیر دستان چنین باشد طریقِ حق پرستان

بہرام نے تمام دیوزادوں کو معاف کردیا، وہ سب اس کے مطیع ہوگئے، سمنبو نے بتایا کہ یہاں ایک افرع نام کا دیو ہے جو نہایت ہیبتناک ہے، اس دیو نے جہان افروز نامی پری زاد کو قید کر رکھا ہے، بہرام افرع کو سبق سکھانے اور جہاں افروز کو آزاد کرنے نکل پڑتا ہے، ایک گہری کھائی میں اتر کر افرع دیو کو قتل کرکے جہاں افروز پری کو آزاد کرتا ہے، ایرانیوں کی رسم کے مطابق افرع دیو کے خاتمے پر بہرام تین روز تک جشن مناتا ہے ~

سه روزه آنجا شہنشه خورده باده بدل غمگین ولی ابرو کشاده

اس کے بعد بہرام اپنے بنائے ہوئے منصوبے کو پورا کرنے کی خاطر نکل پڑتا ہے ~

که تا نارد بجنگ آن دیو ، بهرام نیارد روی خود سوی گل اندام

چین کو روانگی سے قبل دیوزاد صیفور بہرام کو اپنے سر کے بال دیتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ جب بھی اسے کسی مدد کی ضرورت پڑے تو انہیں آگ دکھا دے، تمام دیوزاد اس کی خدمت میں حاضر ہوجائیں گے ~

که چون با ساعت فتد نا گہان کار بنه این مو بآتش شاه ز نہار

چلتے چلتے ایک رات بہرام نے چشمہ سار کے کنارے دم لیا، وہاں پر ایک خوبصورت باغ تھا ~

شب تیره کنارِ چشمه ساری فرود آمد میانِ مرغزاری

اس پر فضا مقام پر بہرام اپنی بدقسمتی کا رونا روتا ہے اور بارگاہ خداوندی میں مناجات کرتا ہے، بہرام زرتشتی مذہب کا پیرو تھا، ایرانی شعرا اسے مسلمان بنا کر پیش کرتے ہیں ~

چه ریخت این نبود شفای چه درد است این که باشد بیدوای

مناجاتِ بہرام :- بنمای دری ، بر روی بهرام کزان در اول بنماید گل اندام

از تاهِ عشقِ صادق اثر با است به اہل درد، حضرت رانظر با است

دوسری صبح بہرام اپنی منزل کی طرف بڑھ گیا اور صبح و شام ایک ماہ تک بے تکان چلتا رہا، وہ ایک دریا کے کنارے پہنچا، وہاں ایک کشتی میں سوار چند مسافر ملے، جہاں پیا کے ساتھ بہرام بھی اس کشتی میں سوار ہوگیا، بیچ دریا میں ایک ہیبت ناک مگرمچھ نے کشتی پر حملہ کیا، بہرام نے تلوار کی ایک ضرب سے مگرمچھ کے ٹکڑے کردیے، کشتی کا ملاح مفتاح بہت خوش ہوا، چند دنوں بعد مفتاح بہرام کو چین کے ساحل پر بہ خیر و خوبی اتار دیا۔

ادھر قیصرِ چین اپنی ''بت چینی'' کی مانند لڑکی کے لیے موزوں رشتہ تلاش کر رہا تھا مگر کوئی بھی اس کے معیار پر نہ اترتا اور مایوس لوٹتا تھا ~

ہمی خواهد بت چینی ز قیصور نمی خواهد بدا ما دلیش فغفور

کنون آمد ، بستاند ، بنا کام قیصور آن ، بت چینی گل اندام

بلغار کے بادشاہ نے رشتہ کی پیش کش کی تھی، ناکام ہونے پر بلغار کے بادشاہ بہزاد نے بھاری لشکر کے ساتھ چین پر دھاوا بول دیا تھا، فغفور چین خوف زدہ ہوکر گوشہ نشین ہوگیا۔

بہرام ایک گنبد نما مقام سے یہ منظر دیکھ رہا تھا جس کا متوتی ستار نامی شخص تھا، بہرام نے صیفور نامی دیوزاد کے بال جلائے، وہ فوراً حاضر ہوگیا، صیفور نے بہزاد کی فوج کے پرخچے اڑادیے۔

جوابش داد صیفور نکو رای　　اگر کوہی بود گیریمش از جای

بہزاد اپنی فوج کی غارت گری دیکھ کر پریشان ہوگیا، بہزاد شیر کی طرح بہرام کا متلاشی تھا مگر جنگلی گدھے کی طرح بہرام کا شکار ہوگیا۔

چو شیری بود جویای گل اندام　　چو گوری شد شکار شاہِ بہرام

صیفور نے بہزاد کا سر گوپھن کے ذریعہ چین کے قلعہ کے بلند دروازے پر دے مارا اور فتح مندی کے ساتھ چین میں داخل ہوا۔

سرِ بہزاد را بر نوک ژوپین　　بزد صیفور بر دروازۂ چین

قیصورِ چین نے باہر آکر دیکھا تو اسے یقین ہوگیا کہ یہ سر ملعون بہزاد ہی کا ہے۔

چین پہنچ کر بہرام نے بھیس بدلا اور گل اندام کے محل کے نیچے اس کے دیدار کا منتظر ہوا، گل اندام تین دنوں بعد حسب معمول جلوہ دکھانے جھروکے میں نمودار ہوئی۔

سہ روز دیگر آن ماہِ گل اندام　　کہ باشد خلق عالم مرا دلآرام
در منظر ز ہم خواہد کشودن　　جمال خود را بما خواہد نمودن
بدین امید از اطرافِ آفاق　　شدہ حاضر بمیدان جملہ عشاق

گل اندام کے عاشقوں کی دیوانگی اور ان کی بدحالی اس وقت قابلِ دید تھی۔

یکی را کشتہ زنجیر محکم　　ہمی زد نعرہ در ہجران در غم
یکی را دیدہا بکشودہ سیلی　　چو مجنون از فراق روی لیلیٰ
یکی سرگشتہ عشاق بہرام　　شدہ در فکر و سودای گل اندام

اسی دوران نوروز کا تہوار آگیا، گل اندام کی کنیزیں خرید وفروخت کے لیے بازار میں آئیں، بہرام نے موقع پاکر اپنی انگوٹھی ان کنیزوں کی طبق میں ڈال دی۔

گل اندام نے اپنے عاشق صادق کی انگوٹھی پہچان لی اور اس کے بعد ہردو میں طویل محبت نامے شروع ہوئے، گل اندام کی معتبر کنیز دولت نے نامہ بر کا کام شروع کیا، ان خطوط میں دونوں طرف سے عشق و محبت کا منظوم اظہار ہے، (یہ مراسلے منظوم عشقیہ خطوط کی اچھی مثالیں ہیں)۔

عاشق و معشوق کی مراسلہ نویسی کے بعد امین کہانی کے تانے بانے کو پچھلے واقعہ سے جوڑ کر بہرام گور کی داستان کو آگے بڑھاتے ہیں، داستان کے ابتدائی حصہ میں بہرام گور شکار کے دوران اپنے محافظ دستے سے جدا ہوگیا تھا، روم کے شہنشاہ کو تلاش کے بعد بھی بہرام گور کا سراغ نہیں ملتا تھا، بالآخر شاہِ روم کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ خبر ملی تھی کہ بہرام ملک چین پہنچ گیا ہے، شاہ روم نے اپنے معتبر انشا نگار مہندس کو قیصرِ چین کے نام مکتوب لکھنے کا حکم دیا۔

کہ مکتوبی نویس از من بقیصور　　بلوحِ سیم چون لولوی منثور

اس مکتوب میں شاہ روم نے قیصر چین کی بیٹی گل اندام کے لیے بہرام سے شادی کا پیغام مہندس کے ہاتھوں بھیجا۔

فرستادن مہندس سوی شاہ　　کہ خاقان را کند زین حال آگاہ

کشورِ روم نے بہرام کو ڈھونڈنے کے لیے شب رنگ نامی عیار کو روانہ کیا، یہ شاطر عیار فوراً اس گنبد والے بوڑھے "ستار" کے پاس پہنچا اور اس سے بہرام کا اتا پتا دریافت کیا، بہرام کا پتا ملتے ہی عیار نے شاہ روم کو اطلاع دی۔

پیدا گشت شاہ روم بہرام　　ز خورشید حجابش یافتم کام

ادھر مہندس کو شاہ چین نے دربار میں طلب کیا اور اسے وہ نیزہ اور ژوپین دکھایا جو اسے چین کے دروازے پر ملا تھا، مہندس نے بہرام کے نیزہ اور ژوپین کو پہچان لیا۔

بر آورد از جگر سوزندہ یک آہ　　بخاقان گفت کہ است این نیزہ شاہ
محقق شد کہ در چین است بہرام　　بباید جنبش، بخواب و آرام

اس موقع پر امین نے بہرام کو بے جان تخت سے اپنی حرماں نصیبی اور بدحالی کا رونا روتے ہوئے دکھایا ہے، بے زبان تخت بہرام کو جواب بھی دیتا ہے، یہ وہی تخت ہے جس پر بہرام اور گل اندام دادِ عیش دیا کرتے تھے، چنانچہ تخت کہتا ہے کہ۔

بدین شادم کہ در سایۂ گل اندام بود دہ روزہ پا بوس مرا کام

اس کے بعد کے منظر میں امین نے قیصر چین کو بہرام کی خبر گیری کے لیے جاتے ہوئے پیش کیا ہے، شاہ چین نے روم کے شہزادے کی آمد پر ایک شان دار ضیافت کا انتظام بھی کیا۔

اشارت کرد شاہ چین بگنجور کہ پیش از دعوت آور آبِ انگور

میکشند ہر جا سفرہ ہا کرد باز بیاوردند بریان بط وقاز

ہمی خوردند بادہ تا شام شہِ چینی و شہِ روم بہرام

یہاں سے داستان ایک نیا موڑ لیتی ہے، بہرام گور سے متعلق ہندوستانی قصوں میں بلغار کے بادشاہ کے بھائی نوشاد کا کہیں ذکر نہیں ہے، امین نے قصہ کو طولانی بنانے کی غرض سے یہ قصہ بڑھادیا ہے۔

بلغار کے بادشاہ بہزاد کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اس کا بھائی نوشاد چین پر حملہ آور ہوتا ہے، بہرام ایک خط کے ذریعہ نوشاد کو مطلع کرتا ہے کہ بہزاد کا قاتل چین کا بادشاہ نہیں ہے بلکہ خود بہرام ہے۔

بہ دان اے خسرو بلغار نوشاد کہ بر دست آمد قتل بہزاد

بہرام دوبارہ دیوزادوں کی مدد سے نوشاد کا قلع قمع کرتا ہے اور اس طرح نوشاد سے بہرام کی متواتر تین جنگوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے، ایرانی رسم کے مطابق بہرام اس فتح ونصرت کے بعد جشن مناتا ہے۔

کہ چون در خاک شد بیچارہ نوشاد بگلش رفت سلطان با دلی شاد

بہرام کا دل عشق سے رنجور تھا، وہ شاہ چین کے ارادوں سے غافل تھا، عاقل گنجور کی معرفت شاہ چین نے بہرام تک یہ پیغام بھیجا کہ اس کی ایک سرکش لڑکی ہے اور اس کا کوئی نرینہ جانشین نہیں ہے، لہذا وہ بہرام سے بہی خواہی کا طالب ہے۔

ندارم ہیچ فرزند جوان بخت کہ بعد از من نشیند برسرِ تخت

ولیکن دختر سرکش گل اندام نمیکرد بعالم با کسی رام

بہرام فوراً دیوزاد حمیطا کو بال جلا کر طلب کرتا ہے اور دونوں پری زادیوں، سمنبو اور

جہاں افروز کو لے آنے کی تاکید کرتا ہے تاکہ یہ دونوں پریاں گل اندام کو بہرام کے لیے رام کرسکیں۔

حمیطا را بباید رفت این دم بدان کاخ رفیع و باغ خرم

کہ آرد آں دو خاتون پری زاد سمنبوی و جہاں افروز دلشاد

جب یہ پریاں بہرام کے سامنے آتی ہیں تو بہرام ان کے ہم راہ، گل اندام کی خواستگاری کے لیے ڈھیر سارے تحایف کے ساتھ روانہ کرتا ہے۔

صد و پنجاہ طشتِ سیم و زر کار ثنا را پر از لولوی شہوار

بہرام کے حکم سے یہ پری زادیاں کاخ گل اندام کے تحایف کے ساتھ داخل ہوتی ہیں۔

بامر شاہ عالم کمینہ بہرام بیامد تا درِ کاخ گل اندام

گل اندام بڑے تپاک سے پریوں کا خیر مقدم کرتی ہے اور ان کے لائے ہوئے تحایف قبول فرماتی ہے۔

اشارت با کنیزی ماہ وش کرد تبرکہا کہ بودش پیشکش کرد

شرم وحیا کے مارے گل اندام کا چہرہ سرخ وسفید ہو چلا تھا، سمنبو کے گل اندام چہرے کے آو بھاؤ سے گل اندام کے عندیہ کا اندازہ لگالیتی ہے۔

رُخ مانند مہرش چوں شفق شد ز شرمش چہرہ چوں، گل در عرق شد

سمنبو گفت نتواں کرد آرام مگر یابم جوابِ شاہ بہرام

بہ ہر نوعی کہ باشد حکم فغفور رضای من بود فرمانِ قیصور

بہرام کو یہ خوش خبری پہنچائی گئی۔

بشارت گفت پیش شاہ بہرام ز گفتار شہِ چین و گل اندام

گل اندام کی رضامندی جان کر بہرام از حد خوش ہوا اور مژدہ گو کو انعام واکرام سے نوازا۔

ازین معنی شہنشاہ گشتہ دلشاد بہ مژدہ، تاج و اسپ و خلعتش داد

اب بہرام کے عقد کی تیاریاں عمل میں آتی ہیں، اصطرلاب کی مدد سے مبارک گھڑی کا انتخاب ہوتا ہے، مہندس ہزاروں اونٹوں پر بری (عشرہ) کا سامان لاد کر شاہ چین کے یہاں روانہ کرتا ہے۔

هزار و چار صد بارِ شتر بود که مفرش را بسیج و شرب پر بود

ز روح افزا صد و پنجاه اشتر همه در زیر بار نقره و زر

روانه شد بقصر سبز در حال فلک گفتا زہی جاه و زہی حال

بہرام رقص وسرود کی محفل آراستہ کرتا ہے اور سب کو حسب مراتب نقد وجواہر بخشتا ہے، ایک کنیز عود بر نہایت خوش الحانی کے ساتھ ایک مخمس پیش کرتی ہے ؂

مقام عیش و ہنگام وصال است زوال ہجر و عشرت باکمال است

چنانچہ عقد کے بعد بہرام خلوت کدہ میں جاتا ہے ؂

بخلوت کرد مسکن شاهِ بهرام شراش در سر و در بر گل اندام

گل اندام کی صحبت میں ایک ماہ گذر جاتا ہے ؂

ازیں احوال چوں بگذشت یک ماه که بودی هم قران خورشید با ماه

(بہرام-فلک=خورشید) (ماہ-پارہ=گل اندام)

گل اندام کے ساتھ متواتر ایک ماہ شب و روز گذار کر بہرام صبح سویرے مہندس کو حکم دیتا ہے کہ وہ چین کے شہر "گلشن آباد" میں ایک جشن منعقد کرے، اس میں خاص و عام کو مدعو کرے تاکہ وہ ہر کس و ناکس کو اپنی عطاؤ بخشش سے سرفراز کر سکے ؂

بکن طوفی درونِ گلشن آباد بده جشنی بنبود در گلشن آباد

که احوالِ عطایم خاص و عام به انواع هم یابند خاص و عام

مہندس شاہی فرمان کو بجالاتا ہے اور ایک عالی شان شامیانہ سجاتا ہے جو دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کردیتا ہے ؂

بیاوردند هر جا سایه بان ها گذشت از سقف منظرِ سایه بان ها

بہرام کی دی گئی شاہی دعوت کا منظر قابل دید تھا ؂

صد و پنجاه هزار گو سفندان همه یا نمهٔ یک ساله دندان

هزار اشتر سه ساله فربه که بودی هر یکی از دیگری به

هزار و چار صد از آب پروار ز گاواں بے شمار و مرغ بسیار

برای خوف سلطان سر بریدند غلامان جمله در مطبخ کشیدند

اسی شاہی دعوت کا سلسلہ ایک ماہ تک چلتا رہا اور امیر و فقیر کی یکساں تواضع ہوتی رہی، دعوتِ ولیمہ کے اختتام کے بعد بہرام گور ایک سجے سجائے شامیانے میں داخل ہوتا ہے وہاں پر شرابِ انگوری اور پرتگال کا دور چل رہا ہوتا ہے، ہر طرف الوانِ نعمت چنے ہوتے ہیں، یہ منظر قابل دید ہوتا ہے ؂

چو سر خوش گشت شاه از بادهٔ ناب بیاوردند ساغر های جلاب

نبوشیدند اول چوں کز شربت بیاوردند صد الوانِ نعمت

الوان نعمت کی تفصیل ملاحظہ کیجیے:

طبقها جملگی سیمین زرکار پراز انگور و انجیر و به و نار

درونِ صحن چینی فلک فام پراز نقل و نبات و مغز و بادام

کز عفر در طبق سیمین بمجلس همیز و طنبها به شاخ نرگس

پراز شربت بهر جاِ ساغرِ رز که عارش آمد مئے از حوض کوثر

دمِ سنبوسها از دل ربای شکسته رونق مشکِ خطای

درون صحن از حلوای یاقوت که جا خاتم نگینی بود، یاقوت

شاہی میزبانی کے الوان نعمت اتنے بچ گئے تھے کہ اہل چین اس کو ایک ماہ تک کھاتے رہے ؂

برون بردند چنداں نعمت شاه که اهل چین می خوردند یک ماه

شاہی دعوت سے فارغ ہوکر بہرام نے تمام ارکان دولت وغیرہ کو شاہی خلعت ؂

چو فارغ گشت شاه. روم از خوان بیاوردند خلعت هایِ الوان

بہزاد اور نوشاد کے لشکریوں کے علاوہ گنجور اور مہندس کو بھی بہرام نے مالا مال کیا۔

چین میں بہرام کو رنگ رلیاں مناتے ہوئے چھ مہینہ سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا، ایک رات اس نے بوڑھے ماں باپ کو خواب میں رنجیدہ دیکھا، ان کی آنکھوں سے بہرام کے فراق میں خون کے آنسو بہہ رہے تھے، نقاہت کے باعث وہ نڈھال ہوگئے تھے ؂

پدر را دید رنجور اوفتاده بروی خویش سیلِ خون کشیده

بقامت گشتہ مانند بلائی نمانده از وجودش جز خیالی

بہرام نے دیوزاد صیفور اور مہندس کو بلا کر اپنا خواب بیان کیا، مہندس نے مشورہ دیا کہ بوڑھے ماں باپ کی حالت ناگفتہ ہوگئی ہے لہذا بہرام کو ان کی خبر گیری کرنی ضروری ہے۔

زخد بگذشت دردِ شاه کشور رود دودش بسر مانند مجمر

کہ سلطان از فرقت دلفگار ست نشستہ روز و شب در انتظار ست

بہرام نے مہندس کو شاہ چین کے پاس، روم کو واپس جانے کی اجازت لینے کی خاطر بھیجا، مہندس نے بادشاہ کو سارا حال سنایا، بادشاہ نے بہرام کی کارگذاریوں کی بہت توصیف کی، مہندس نے بڑی لجاجت سے اجازت مانگی۔

اگر بخشد اجازت نامور شاہ بملک روم آریم روی در راہ

شاہ قیصور نے رنجیدہ خاطر ہو کر بہرام کی درخواست قبول کر لی۔

بہر نوعی کہ خواہد شاہ را دل رضای او ز پیش مات حاصل

مہندس خوشی خوشی بہرام کے پاس آیا اور اسے یہ جاں فزا مژدہ سنایا۔

شاہ قیصور نے اپنے داماد کو سارے خزانے اور دفینے عطا کر دیے۔

بیوتان ده ہزار از مال و زر ہمہ سیم و زر و لولوی شہور

کئی ترکی غلام، تازی گھوڑوں پر سیمیں زینوں کے ساتھ بہرام کے ہم راہ گئے، ساتھ ہی بہزاد اور نوشاد کی فوج کے سپاہی مع ساز و سامان کے بہرام کے ساتھ روانہ ہوئے۔

بجان و دل دعای شاہ کردند بہ امرِ شاہ رو در راہ کردند

شاہ چین بہرام کو الوداع کہنے آیا اور بہرام کو گل اندام کا خصوصی خیال رکھنے کی تاکید کی۔

چنیں گفتا شہ چینی بہ بہرام کہ نیکو با خبر باش از گل اندام

وداع شاہ رومی کرد خاقان روان شد با سپاہ خویش سلطان

شب رنگ عیار نے رات دن مسافرت کے بعد ۱۵۰ فرسنگ کا فاصلہ طے کیا اور شاہِ روم کو بہرام کے وطن لوٹنے کی اطلاع دی، شب رنگ نے شاہ روم کو بہرام کے مافوق الفطرت کارناموں کی سرگذشت سنائی۔

ز شب رنگ آن سخن بشنید سلطان تعجب کرد و شد این حال حیران

شاہ روم نے بہرام کے استقبال کا انتظام کیا۔

روان گشتند با سلطان ایام ولی شاداں شاداں با استقبال بہرام

شاہ روم کا پرچم دیکھتے ہی بہرام تعظیم کے لیے گھوڑے سے اتر پڑا۔

چو دید از دور چیترشاہِ ایام پیادہ شد از مرکب شاہ بہرام

پدر را دید چوں آ نگاه بہرام بزد زانو بہ پیش شہ دو صد گام

شاہ روم نے بہرام کو بے تحاشا گلے سے لگایا۔

چو کشور دیده بر شہزاده بکشاد تو گفتی بیخود از مرکب در افتاد

بزیر آمد ز مرکب دیدۂ پر غم کشیده مدتی در فرقتش غم

مثنوی کے آخری منظر میں بہرام کی وطن کو واپسی کی عکاسی کی گئی ہے، بہرام اپنے باپ کی پابوسی کرتا ہے اور ایرانی رسم کے مطابق اس کے رخسار سے اپنے رخسار رگڑتا ہے اور سلطان کے دست پر بوسہ دیتا ہے۔

گرفتش در برو بوسید رویش نہادی روي بر رخسار و مویش

شہنشہ دست سلطان بوسہ دادی بفرقت روی بر پایش نہادی

فراز تخت زرین جای او داد بپای تخت کشور شاه ایستاد

کشور روم نے بہرام کو قلعے کی چابیاں اور سارے خزانے دے دیے۔

کلید قلعہ و گنج و خزینہ بہر آن چیزی کہ بودش دفینہ

بہرام نے روم میں نہایت عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی۔

چناں بنمیاد و عدل کرد در روم کہ شد فردوسِ اعلا آں بر و بوم

بتاریخ ایں چلیم گفت استاذ کہ شاہی کرد او صد سال آزاد

اس کے بعد بہرام کہاں گیا اور اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟ کسی راوی کو اس کا پتہ نہیں ہے۔

ز حالِ مرگ اینشا نم خبر نیست حکایت چو پایانی دگر نیست

مثنوی بہرام وگل اندام کا تنقیدی وتحقیقی جایزہ

فارسی ادب میں صنف مثنوی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، اس صنف سخن میں طولانی قصوں کے لیے کافی گنجایش ہے، مختلف موضوعات کو اشعار کی قیود و بند کے بغیر منظوم کیا جاسکتا ہے، فارسی شعرانے اس صنف سخن میں رزمیہ، بزمیہ، عشقیہ او صوفیانہ مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں، فردوسی کا شاہنامہ، رومی وعطار کی مثنویاں اپنا ثانی نہیں رکھتیں، خدائے سخن نظامی گنجوی، جامی اور امیر خسرو کی مثنویاں موضوع اور فن کے اعتبار سے کافی مقبول ہیں، عشقیہ مثنویوں میں یوسف زلیخا، لیلی مجنوں، شیریں خسرو، وامق وعذرا، بہرام وگل اندام اور بہرام گور وبانو حسن جیسے عنوانات پر عربی، فارسی، ترکی اور اردو زبان میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔

اکثر شعرانے قدیم ایران کے تاریخی ہیرو بہرام بن یزدجرد پنجم کی معرکہ آرائیوں، سیرو شکار، مافوق الفطرت کارناموں اور عشق وعاشقی کی داستانوں کو شعری جامہ پہنایا ہے، ان داستانوں کے اکثر نسوانی کردار پری زادیاں ہیں، البتہ گل اندام بنت آدم ہے، ان داستانوں کے تانے بانوں میں ہندوستانی عناصر نمایاں نظر آتے ہیں، مثلاً جب بہرام گور بانوی حسن کو اپنی پری زاد سہیلیوں کے ساتھ حوض میں نہاتے ہوئے دیکھتا ہے تو بہرام شرارتاً ان کے کپڑے چھپا دیتا ہے، اس پس منظر میں ہندوستانی دیومالائی کردار کرشن کی وہ حرکت یاد آجاتی ہے جب اس نے اپنی محبوبہ رادھا اور اس کی سہیلیوں کے کپڑے چھپا دیے تھے، اس سے ظاہر ہے کہ ان کہانیوں کا سوداگروں، سیلانیوں، سیاحوں، مسافروں اور سپاہیوں کے ذریعہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں آدان پردان ہوتا رہا ہے اور مقبول عام داستانوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوتے رہے ہیں، داستان بہرام وگل اندام بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس داستان کے ترکی، پشتو، روسی اور ہندی زبان میں ترجمے ہوچکے ہیں، اسی داستان کو تھوڑی سی ردوبدل اور ناموں کے ہیر پھیر کے ساتھ الگ الگ قصوں میں ڈھال دیا گیا ہے، بہرکیف یہ داستان دیگر مافوق الفطرت داستانوں کی طرح ہر طبقہ میں قبول عام کی سند حاصل کرچکی ہے۔

امین سبزواری کی زیر نظر مثنوی غیر ضروری طوالت کی وجہ سے بے مزہ ہوگئی ہے، قصہ کا ربط قصہ کے جوڑ توڑ سے ڈھیلا پڑ گیا ہے، بہرام فوری طور پر مافوق الفطرت کرداروں پر حاوی ہو جاتا ہے اور یہ کردار اس کے فوراً مطیع بھی ہوجاتے ہیں، ایک آدم زاد میں بہ یک وقت اتنی

خوبیاں پیدا ہونا محال ہے، لہذا بہرام کے یہ کارنامے قاری کو زیادہ متاثر نہیں کرتے، افرع دیو کی شکست اور خونخوار مگرمچھ کا خاتمہ ایسی مثالیں ہیں، اخلاقی طور پر اعلی وارفع خاندان کی شہزادیوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنا جلوہ غیر مردوں کو دکھائیں، امین نے شہزادی گل اندام کے کردار کو کسی حد تک داغ دار کردیا ہے، بہرام نہایت کامیابی کے ساتھ وہ تمام مراحل طے کرلیتا ہے جس کی خاطر اس نے اتنی صعوبتیں برداشت کی تھیں، بہرام کو ایک حق پرست، عوام کا بہی خواہ اور ایک سعادت مند بیٹے کے طور پر پیش کیا گیا ہے، یہی اس داستان کا سب سے کامیاب پہلو ہے۔

امین کی زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے، اشعار رواں دواں ہیں، قاری کو زبان کی چاشنی غیر ضروری طوالت کی وجہ سے پھیکی لگنے لگتی ہے، تاہم امین سبزواری کی اس مثنوی کو ایک بہتر مثنوی کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔

داستان کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے امین نے عاشق ومعشوق کے مابین تقریباً بارہ منظوم خطوط لکھے ہیں لیکن ان میں جاذبیت کا فقدان ہے، البتہ امین نے گل اندام کا سراپا پیش کرنے میں اپنی شاعرانہ فن کاری کے جوہر دکھائے ہیں، امین کے سراپے کو فارسی ادب کی نمایندہ مثنویوں کے سراپوں کے مقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔

زبان وبیان کے اعتبار سے یہ مثنوی بہت ممتاز خصوصیات کی حامل نہیں ہے، صنائع بدائع کا استعمال بھی مروجہ مثنویوں کی طرح ہے، یہی وجہ ہے کہ امین کی مثنوی کے کینوس پر کوئی خاص رنگ وروغن نظر نہیں آتے جن کی تعریف کی جاسکے، البتہ امین کو ایک اچھا مثنوی گو شاعر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

جل گاؤں کا ایک سفر

از ضیاء الدین اصلاحی

مدیر آموزگار جناب اکبر رحمانی مرحوم اپنی زندگی میں متعدد بار مجھے جل گاؤں (مہاراشٹر) آنے کی دعوت دے چکے تھے، کئی بار پروگرام بھی بنا مگر اس کی نوبت نہیں آئی اور گزشتہ سال وہ ۱۷؍ ستمبر کو اللہ کو پیارے ہوگئے، اس کے بعد ہی سے ان کے صاحب زادے جناب سہیل احمد رحمانی مجھ سے برابر رابطہ قائم کیے ہوئے تھے کہ ان کے والد کی کچھ کتابیں چھپ رہی ہیں، ان کی تقریب رونمائی میں مجھے جل گاؤں آنا ہے، ان کے اصرار اور ان کے والد سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر میں نے حامی بھر لی، چنانچہ جب "خاندیش کی ادبی خدمات" چھپ گئی اور ۱۲؍ اکتوبر کو اس کی رونمائی کی تقریب متعین ہوگئی تو میں نے بھی رخت سفر باندھا جس کی روداد سپرد قلم کر رہا ہوں۔

۱۲؍ اکتوبر کے پروگرام میں شرکت کے لیے میں نے ۱۰؍ اکتوبر کو گودان اکسپریس سے روانگی کا پروگرام بنایا، یہ ٹرین جل گاؤں نہیں رکتی اس لیے اس سے ۲۵ کلومیٹر پہلے بھساول اتر جانا پڑا جہاں سہیل رحمانی اپنے ایک دوست کے ساتھ موجود تھے اور وہ مجھے کار سے جل گاؤں اپنے گھر لے گئے۔

۱۰؍ اکتوبر کو جمعہ تھا، گاڑی کے اعظم گڈھ پہنچنے کا وقت ۱۰ بجے دن میں تھا، جمعہ نہ چھوٹنے کے خیال سے میں نے جون پور سے ٹکٹ لیا تھا، جہاں میری چھوٹی بیٹی ناہید عرصے سے میرے آنے کا تقاضا کر رہی تھی مگر وہاں بھی گاڑی پہنچنے کا وقت ۱۲ بج کر ۴۵ منٹ ہے، پتہ چلا کہ گاڑی ۳۰ منٹ لیٹ ہے، وہ کچھ اور لیٹ ہوگئی اور مجھے اسٹیشن کے قریب کی مسجد میں جمعہ مل گیا فالحمدللہ۔

جون پور میں گاڑی پر سوار ہونے کے لیے میں ۹؍ اکتوبر ہی کو ۳-۴ بجے کے درمیان اعظم گڈھ سے بس سے روانہ ہوا، بس اسٹیشن سے ۵-۶ کلومیٹر دور جانے کے بعد راستہ ایسا جام تھا کہ نہ بس آگے جا سکتی تھی اور نہ پیچھے آسکتی تھی، دن ڈوب جانے کے بعد ہی بس وہاں سے آگے بڑھی، یہ صورت اس لیے پیش آئی کہ اتر پردیش کی جمہو وزارت کے ایک کابینی وزیر، وزیر ہونے کے بعد پہلی دفعہ اعظم گڈھ تشریف لا رہے تھے، ان کو خوش آمدید کہنے والوں کی بہ کثرت گاڑیوں کی وجہ سے یہ بھیڑ ہوگئی تھی، وزیر صاحب تو مبارک باد لے رہے تھے اور ہزاروں مسافر نہ جانے کہاں کہاں جانے والے یا ریل سے سوار ہونے والے گاڑی چھوٹ جانے کے اندیشے سے سخت کوفت اور ذہنی اذیت میں مبتلا تھے لیکن بھلا خوشی میں سرشار جمہوری اور عوامی حکومت کے وزیر صاحب اور ان کا استقبال کرنے والوں کو عوام کی اس پریشانی کا کیا اندازہ ہوگا مگر ہماری پریشانی یہیں ختم نہیں ہوئی ع ابھی تو معرکے باقی چمن میں اور بھی ہیں۔

ہندو قوم کے تہوار سڑکوں پر منائے جاتے ہیں اور ایک ہی تہوار کئی کئی جگہ متعدد روز تک منایا جاتا ہے، دسہرہ کا تہوار ہر ہر بازار بلکہ معمولی گاؤں میں بھی منایا جاتا ہے، اس کی وجہ سے مسافروں کو "آمد ورفت" کی جو صعوبتیں اور زحمتیں اٹھانی پڑتی ہیں وہ ناقابل بیان ہیں، میرے راستے میں بھی یہ میلے حائل ہوئے اور ان سے بھی دیر ہوئی۔

سڑکیں عموماً بہت خراب ہیں، جگہ جگہ اور خاص طور پر بازاروں میں بڑے بڑے گڈھے ہوگئے ہیں، اگر یہ بنتی بھی ہیں تو بننے کے ساتھ ہی بگڑنا بھی شروع ہو جاتی ہیں، گھمبیر پور (اعظم گڈھ) میں ایک جگہ دو ٹرک سامان سے لدے ہوئے دونوں سمتوں سے دھنسے ہوئے تھے، ان وجوہ سے دو گھنٹے کا سفر ۵ گھنٹے میں طے ہوا۔

میں تنہا سفر کرتا ہوں تو سکنڈ اے - سی میں سوار ہوتا ہوں، یہ سفر ایک طرف سے اپنے خرچ سے اور دوسری طرف سے سہیل رحمانی کے خرچ سے ہونے والا تھا اور میں اپنی طرح ان پر بھی زیادہ بوجھ ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا، اس لیے اکیلے ہونے کے باوجود سکنڈ کلاس کے سلیپر میں گیا اور آیا، جاتے وقت تو زیادہ زحمت نہیں ہوئی، آتے وقت کا حال آگے آئے گا۔

۱۱؍ اکتوبر کو جل گاؤں پہنچنے کے دن شب برات تھی، قریب کی مسجد کے مصلیوں نے سہیل رحمانی صاحب کے توسط سے اس موضوع پر عشاء بعد تقریر کرنے کا پیغام بھیجا مگر انہوں نے میری تکان کی وجہ سے معذرت کر دی تھی۔

۱۲؍ اکتوبر کو ۱۰½ بجے دن میں کتابوں کے رسم اجرا اور مرحوم اکبر رحمانی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے علاوہ جل گاؤں کے ڈپٹی میئر جناب عبدالکریم سالار اور کارپوریٹر ملک عبدالغفار کی استقبالیہ تقریب قرآن مجید کی تلاوت و ترجمہ سے شروع ہوئی، گل پوشی کے بعد جناب شمیم طارق کے ہاتھوں مرحوم اکبر رحمانی کے کتابچے "ہندوستان مسلمانوں کا فادر لینڈ" اور راقم کے ذریعہ "خان دیش کی ادبی تاریخ" کی رونمائی ہوئی، سب سے پہلے سہیل رحمانی صاحب نے تقریب کے انعقاد کے اسباب بتائے، کئی مقامی حضرات اور ڈپٹی میئر سالار صاحب اور کارپوریٹر ملک صاحب کی تقریریں ہوئیں، وقت کی کمی کی وجہ سے بعض لوگوں کو موقع نہیں ملا، غلام نبی مومن صاحب پونا سے تشریف لائے تھے، انہوں نے مختصر تقریر پر اکتفا کیا، وہیں سے بشیر انصاری صاحب بھی تشریف لائے تھے، انہوں نے ایک اچھا مقالہ پڑھا، شمیم طارق صاحب (ممبئی) اچھے اہل قلم اور بے باک صحافی ہونے کے علاوہ بہت اچھے مقرر بھی ہیں، ان کی ولولہ انگیز تقریر بہت پسند کی گئی، آخر میں صدر جلسہ کی حیثیت سے راقم نے مرحوم اکبر رحمانی سے اپنے تعلقات کی سرگزشت اور ان کے خاص کارناموں پر روشنی ڈالی اور خان دیش کی ادبی تاریخ کے مندرجات و خصوصیات بتائے، جلسے کی نظامت پروفیسر ذاکر اقرا کالج مہرون نے کی، اس کامیاب جلسے سے جو بے میونسپل

اسکول کے میدان میں ہوا تھا اور حاضرین کی کثرت سے اکبر رحمانی مرحوم کی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔

جلسے میں ای-ٹی-وی کے نمایندے امتیاز خلیل صاحب بھی اپنے اسٹاف کے ساتھ موجود تھے، یہ پروگرام بعد میں ریلے بھی ہوا۔

جل گاؤں کو میں نے اپنے تصور و خیال سے بڑھ کر پایا، یہاں مسلمانوں کی آبادی ۱۲ فی صد ہے، ان میں ہر درجے کے لوگ ہوں گے، میں متوسط اور نسبتاً خوش حال اور جدید تعلیم یافتہ طبقے سے ملا تھا، ان کی دینی، اخلاقی اور سماجی حالت بہتر تھی، ان کو قوم و ملت کا درد بھی تھا اور ان میں علمی و تعلیمی بیداری بھی تھی، سیاسی شورشوں سے بے تعلق رہنے کے باوجود وہ سیاسی شعور رکھتے ہیں۔

جلسے کے بعد سہیل رحمانی اور ان کے بھائیوں نے اپنے گھر پر مہمانوں کو پر تکلف کھانا کھلایا، اس سے اور نماز سے فارغ ہو کر الحاج عبدالکریم سالار اور الحاج عبدالغفار ملک مجھے اور جناب شمیم طارق اور ای-ٹی-وی کے نمایندے امتیاز خلیل کو شہر سے ۵ کلو میٹر کے فاصلے پر مہاڑی لے گئے جہاں ۱۱۲ ایکڑ کے رقبے میں اقرأ ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت سالار صاحب کی سرکردگی میں طبیہ کالج، بی ایڈ کالج، طبیہ ہاسپٹل چل رہے ہیں، اسی کمپاؤنڈ میں طلبہ و طالبات کے ہاسٹل اور اساتذہ کی رہایش گاہیں بھی ہیں، ایک مسجد اور بعض عمارتیں ابھی زیر تعمیر ہیں، یہ جگہ بڑی پُر فضا ہے اور ساری عمارتیں خوبصورت اور تناسب سے بنی ہوئی ہیں۔

واپسی میں ہم لوگ شہر کے محلہ مہرون آئے، یہاں بھی سالار صاحب کی سربراہی میں اقرأ آرٹ اور سائنس کالج، آئی-ٹی-آئی کالج اور شاہین ہائی اسکول چل رہے ہیں، ان کی عمارتیں بھی دل فریب اور مستحکم ہیں۔

مغرب بعد کا وقت شاہین لائبریری میں گزرا جو جناب معین الدین عثمانی، صغیر احمد اور عبدالوحید انصاری اور ان کے احباب کی کوششوں کا نتیجہ ہے، یہ سب لوگ صاحب ذوق اور علم و ادب سے شغف رکھنے والے ہیں اور لائبریری کی سالانہ میگزین "شاہین" کے نام سے نکالتے ہیں جس کے تیرہ شمارے نکل چکے ہیں، تیرہواں شمارہ اور عثمانی صاحب کا مرتب کردہ افسانوں کا مجموعہ "متحرک منظر کی فریم" مجھے بھی عنایت کیا گیا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔

مرحوم اکبر رحمانی کے مخلص دوست اور اقرأ اینگلو اردو ہائی اسکول میں ان کے رفیق کار محمد فاروق اعظمی سابق پرنسپل نے مجھے اور میرے ساتھیوں شمیم طارق او امتیاز خلیل کے علاوہ عبدالکریم سالار اور عبدالغفار ملک صاحبان کو رات کے کھانے پر بلایا تھا، فاروق صاحب کا اصل وطن مبارک پور ہے۔ وہ شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی صاحب کے داماد ہیں، انہوں نے شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج سے بی-اے اور بی ایڈ کیا تھا، اسی زمانے سے میری ان کی ملاقات اور دوستی تھی۔

اسی شب میں سالار صاحب کے دولت کدے پر شمیم طارق صاحب کے اعزاز میں ایک شعری نشست ہوئی، سالار صاحب اور ملک صاحب کے اصرار پر اس میں بھی شریک ہوا اور مجھے ہی صدارت بھی کرنی پڑی، اس بہانے سے جل گاؤں کے شعرا سے ملنے اور ان کے کلام سے محظوظ ہونے اور آخر میں اپنے تاثرات کے اظہار کا موقع ملا۔

۱۳/ اکتوبر کو اقرأ اینگلو اردو اسکول و کالج کو اس کے منیجر اور انجمن تعلیم المسلمین جل گاؤں کے صدر الحاج عبدالغفار ملک کی رہنمائی میں دیکھا، اسے اس لیے دیکھنے کا زیادہ اشتیاق تھا کہ اکبر رحمانی مرحوم کا تعلق اسی سے تھا، اس کی عمارتیں اور مسجد بھی اچھی اور مستحکم بنی ہوئی تھی، جل گاؤں کے ان مسلم اداروں کا رکھ رکھاو، سلیقہ مندی، صفائی اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ انتظامیہ کے سربراہ اور کارکن اور طلبہ و اساتذہ میں دینی رجحان اور نماز کا اہتمام پایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو مزید ترقی و استحکام عطا کرے اور مسلمانوں کے لیے انہیں فیض رساں بنائے۔

اینگلو اردو اسکول میں یک بہ یک گھڑی پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ گاڑی آنے کا وقت ہو رہا ہے، گھر آ کر سامان لیا اور اسٹیشن پہنچا تو گاڑی آ چکی تھی، وہاں شاہین لائبریری کے احباب، فاروق اعظمی صاحب اور مرحوم اکبر رحمانی صاحب کے صاحب زادگان پہلے سے موجود تھے، مجھے ان حضرات کے خلوص و محبت کا شکریہ ادا کرنے کا موقع نہ مل سکا، اشاروں سے علیک سلیک کرتے ہوئے جلدی سے اپنے ڈبے میں گھسا اور عمران رحمانی کی معاونت سے اپنی سیٹ تک پہنچا، انہوں نے لوگوں کو ہٹا کر مجھے اپنی سیٹ پر بٹھایا ہی تھا کہ گاڑی نے سیٹی دی، لوگوں نے کھڑکیوں سے الوداعی سلام کہا اور گاڑی چلنے لگی، اس کا نام تاپتی گنگا تھا جو گجرات سے آ رہی تھی اور کارسیوکوں سے بھری ہوئی تھی، یہ لوگ بے تکلف دوسروں کی ریزرو سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے، اگر کوئی اپنی سیٹ تلاش کرتا ہوا آ جاتا تو یہ لوگ بادل ناخواستہ اسے بیٹھنے دیتے۔

کارسیوکوں میں نہ زیادہ جوش و خروش تھا اور نہ وہ کوئی دل آزار اور دل شکن بات کرتے ہوئے دکھائی دیے بلکہ مجھ سے تو یک گونہ احترام کا معاملہ کیا، البتہ چندلڑکے ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں گھوم گھوم کر دل آزار اور اشتعال انگیز نعرے لگاتے رہتے تھے، ایک دفعہ دو ایک آدمی ہماری کوچ میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ کوئی سرکاری آدمی پوچھے تو اجودھیا کے بجائے جبل پور، مئہر، ستنا اور الٰہ آباد وغیرہ کا نام بتایا جائے مگر بنارس تک ٹرین میں نہ کوئی کنڈکٹر آیا اور نہ چکنگ کرنے والا، یہاں تک کہ پولس کا بھی پتا نہیں تھا جو عموماً خواہ مخواہ شریف لوگوں کو تنگ کرتی اور ان کے سامانوں کی تفتیش کرتی ہے۔

اٹارسی میں مرد تو مرد بہت ساری عورتیں بھی سوار ہوئیں اور پوری بوگی اس طرح بھر گئی کہ جو جہاں تھا وہیں پھنس کر رہ گیا، آگے پیچھے جانا ناممکن ہو گیا، لوگوں نے بتایا کہ یہ آدی واسی ہیں، آگے اسٹیشنوں پر

بھی کارسیوک آتے رہے، ریزرو ٹکٹ لیے ہوئے لوگوں کا سوار ہونا اور اپنی سیٹ پر پہنچنا سخت مشکل تھا۔

ٹرین ابھی بھساول ہی میں تھی کہ ایک صاحب فرشتہ رحمت بن کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے آپ فکرمند نہ ہوں میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں، کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا، میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نام دریافت کیا تو بتایا کہ وہ غازی پور جارہے ہیں، ان کے ساتھ بیوی بچے بھی ہیں، جل گاؤں میں جو لوگ آپ کو چھوڑنے آئے تھے، انہوں نے تاکید کی تھی کہ آپ کی خبر گیری کرتا رہوں اور وہ واقعی متعدد بار آئے، ۹ بجے رات میں آکر مجھے اپنی برتھ پر لٹا بھی گئے ورنہ مجھے بیٹھ کر ہی رات گزارنی پڑتی، صبح سویرے بھی آکر میری خیریت دریافت کر گئے اور بنارس اسٹیشن پر ملنے کا وعدہ کر کے اپنے ڈبے میں چلے گئے، مگر وہاں میرے اترنے میں بھیڑ کی وجہ سے تاخیر ہوئی، ادھر ادھر بہت دیکھا مگر وہ نظر نہیں آئے، مجھے ان کی وجہ سے بڑی راحت اور تسکین ملی، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔

گو مجھے خود اس کے علاوہ اور کوئی تکلیف نہیں ہوئی کہ اپنی سیٹ پر بیٹھا اور لیٹا رہا، اپنے کرم فرما کو بھی کسی بات کے لیے زحمت نہیں دی اور عام بشری ضرورتوں کا بھی کوئی تقاضا نہیں ہوا لیکن دوسروں کی زحمتیں اور مشقتیں میرے لیے سوہان روح بنی رہیں، اکثر بے چارے اپنی سیٹوں تک پہنچ ہی نہ سکے، میرے سامنے دو صاحب بڑی زحمت اور پریشانی اٹھا کر آئے اور سخت کشمکش اور مزاحمت کے بعد ہی اپنی سیٹ پر بیٹھ سکے۔

مجھے ریلوے بورڈ اور اس کے عملے سے یہ عرض کرنا ہے کہ یا تو کارسیوکوں کے لیے گاڑیاں مخصوص کردی جاتیں اور ان میں عام مسافروں کو ٹکٹ نہ دیا جاتا، اگر یہ ممکن نہیں تھا تو جن لوگوں نے ریزرویشن کرایا تھا ان کے اٹھنے بیٹھنے اور سونے کی مدد کے لیے ریلوے عملے اور پولس کو موجود رہنا چاہیے تھا، یہ عجیب بات ہے کہ اس طرح کے موقعوں پر نہ کنڈکٹر کا پتا ہوتا ہے اور نہ پولس کا، جب کہ عام حالات میں یہ لوگ سیدھے سادے مسافروں کے لیے زحمت ہی کا موجب ہوتے ہیں۔

کارسیوکوں اور رام بھگتوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ جب وہ اپنے بہ قول ایک مقدس مشن پر جارہے ہیں تو امن وسکون سے جائیں، دوسروں کے لیے زحمت وپریشانی کا باعث نہ بنیں، دوسروں پر جبر وتشدد، ان کے ساتھ ناروا سلوک، ان کے حقوق وعزت نفس کا خیال نہ کرنا اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینا کون سا دھرم ہے، کیا میلوں میں سواریاں نہ جانے دینا، مورتیاں بنانے کے لیے دوسروں سے زبردستی چندے لینا، بلا ٹکٹ سفر کرنا، مسافروں کے لیے زحمتیں اور رکاوٹیں پیدا کرنا، راہ گیروں کے آرام وراحت کا خیال نہ کرنا بلکہ ان سے لڑ بھڑ کر تشدد اور خوں ریزی پر آمادہ ہو جانا ہی رام بھگتی ہے، فرقہ پرست اور جارحیت پسند جماعتیں کب تک سادہ لوح لوگوں کو دھوکا اور فریب دیتی رہیں گی اور دھرم اور پوجا پاٹ کے نام پر بے دھرمی، شور وہنگامہ، نفرت واشتعال اور انارکی پھیلاتی رہیں گی۔

اخبار علمیہ

IRCICA نے چھٹے انٹرنیشنل خطاطی مقابلے کا اعلان کیا ہے، یہ خطاطی مقابلے ہر تیسرے برس اس فن کے کسی بڑے ماہر وممتاز شخص کی نسبت سے منعقد ہوتے ہیں اور اس کا مقصد فن خطاطی کے طلبہ کی حوصلہ افزائی اور نامور فضلا کی خدمات اور کارناموں کو نمایاں کرنا ہے، پہلا عالمی مقابلہ ۱۹۸۶ء میں ترکی خطاط حمید العمیدی (۱۸۸۱-۱۹۸۲ء) کے نام پر ہوا تھا اور دوسرا عالمی مقابلہ عہد عباسی کے مشہور خطاط یاقوت المستعصمی کے نام سے اور تیسرا ۱۹۹۳ء میں ممتاز خطاط ابن البواب (۴۱۳ تا ۱۰۲۲ھ) اور پانچواں ۲۰۰۰ء میں مصری خطاط سید ابراہیم (۱۸۹۷-۱۹۹۷ء) کے ناموں سے موسوم کیا گیا، اس دفعہ کا چھٹا مقابلہ مشہور ایرانی خطاط میر عماد الحسینی (۱۵۵۴-۱۶۱۵ء) کے نام سے ہورہا ہے، پانچویں مقابلے کے وقت مقابلے کے بیس سال گزر چکے تھے، اس کی مناسبت سے ایک تقریب بھی منائی گئی اور اس موقع پر "IRCICA ایوارڈ فار ڈسٹنکشن ان کیلیگرافی" بھی تقسیم کیا گیا، اپنے آغاز ہی سے اس مقابلہ نے دنیا بھر میں اپنی پہچان بنالی ہے اور اس اچھی روش کی تقلید میں مسلم ممالک ہی نہیں دنیا کے اکثر ملکوں میں بھی اس فن سے دل چسپی لی جانے لگی ہے، اس کی بہ دولت خطاطوں کو ایک عالمی تحریک سے جڑنے اور نئے فنی تجربات حاصل کرنے کا موقع ملا ہے، اس کا دوسرا فایدہ یہ ہے کہ دنیا کے متعدد ملکوں کے ماہرین کے یک جا ہونے سے ایک اچھا تہذیبی اور فنی اجتماع ہو جاتا ہے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مقابلہ میں شامل ہونے والوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے اور پہلے سے بہتر کارکردگی بھی سامنے آئی ہے۔

چھٹا عالمی خطاطی مقابلہ خطاطی کے مندرجہ ذیل چودہ ۱۴ اقسام وموضوعات پر منعقد ہورہا ہے، جلی ثلث، ثلث، نسخ، جلی تعلیق تعلیق، تعلیق، دیوانی، جلی دیوانی، کوفی محقق، ریحانی، رقعہ، اجازی، رقعہ مغربی اور خورد تعلیق۔

فاضل پاشا کا مشہور ومعروف مصحف قرآنی بوسنیا وہرزیگوینا، سراجیوو کی غازی حسریو بیگو والائبریری میں محفوظ ہے، اس کا ہو بہو نقل کیا ہوا نہایت خوبصورت اور منقش ایڈیشن طبع کیا گیا ہے، جس کے محدود نسخے تیار ہوگئے ہیں اور الفرقان اسلامک ہیریٹج فاؤنڈیشن، لندن کے چیرمین ایچ-ای شیخ احمد زکی یمینی نے اس کا اجرا کیا، اس کے ہدیے سے ہونے والی آمدنی غازی حسریو بیگو والائبریری کی کتابوں کے تحفظ اور نئی عمارتوں کی تعمیر میں صرف کی جائے گی، فاضل پاشا نے اپنا نسخہ اصلاً غازی حسریو بیگو وامسجد کو ہدیتاً دیا تھا جو ۲ مئی ۱۸۷۲ء میں لائبریری کی ملکیت میں آیا، اس کی نقل داغستان کے ایک شخص نے مئی جون ۱۸۴۹ء میں ۱۱۸۶ء کے لکھے ہوئے

ایک نسخہ سے تیار کی تھی، جس کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ "وہ مشہور صحابی اور کاتب وحی زید بن ثابت الانصاری کے مستند نسخہ سے نقل کیا گیا تھا اور اسے ممالک اسلامیہ کے متعدد علاقوں میں تقسیم کیا گیا تھا"،

یہ جدید ایڈیشن یلدز پرنٹنگ ہاؤس، استنبول سے کمیشن فار دی ریویژن آف دی قرآن کا پیپرز کی منظوری اور جائزہ کے بعد طبع کیا گیا ہے، اس کا ہدیہ ۲۵۰ یوروز ہے، درج ذیل پتہ سے اس کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

Hamdije Kreserljakovice 5871000,

Sarajevo Bosnia & Harzegovena-

Tell. No: 387336518143 (نیوز لیٹر)

سائنس دانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ زمین پر ۴۷۵ ملین سال پہلے سے پودے اگ رہے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ حجری عہد سے ۵۰ ملین سال پہلے زمین پر ان کا وجود ہو چکا تھا، اس عہد کے پودے کے بیج پہلے بھی متعدد بار پائے جاچکے ہیں لیکن ان سے یہ پتہ نہیں لگتا تھا کہ یہ زمینی پودنے ہیں یا آبی، نئے مطالعہ وتحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان کا اصل منبع زمین ہے، یہ انکشاف یونیورسٹی آف شیفیلڈ ان لندن کے سائنس داں چارلس ولمان نے کیا ہے، ان کے خیال میں قدیم حجری آثار خود بھی ۴۲۵ ملین سال پہلے کے ہیں، ان نہایت قدیم بیجوں اور حجری آثار کے درمیان مدت کے تفاوت کے اندازہ کو صحیح نہیں مانا جاسکتا کیوں کہ ابھی سائنس دانوں کو وہ پودے دست یاب نہیں ہوئے جن کے یہ تخم ہیں، البتہ یہ بیج ان بیجوں کے مشابہ ہیں جو کائی میں اگتے ہیں، جنوبی عمان میں تیل کی تلاش کی مہم کے دوران میں سائنس دانوں کو یہ بیج ۹۵۰ فٹ گہرائی میں زمین کے اندر سے دست یاب ہوئے، ولمان گروپ نے چٹان کو برباد کرنے کے لیے تیزاب جیسے مادے کا استعمال کیا تھا جس کے اندر نامیاتی عناصر کو نقصان پہونچانے کی صلاحیت نہیں تھی۔

(ٹائمس آف انڈیا)

فیڈریشن آف اسلامک یونیورسٹیز کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر جعفر عبدالسلام نے اسلامک اسٹڈیز سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ کی تشکیل کی ہے، اس کا مرکز اٹلی میں ہوگا، اس سوسائٹی کے قیام کا مقصد ان تمام طعن و تشنیع بالخصوص اسلام سے جوڑی جانے والی دہشت گردی وانتہا پسندی کا جواب دینا ہے، ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ فیڈریشن کی اکیڈیمک کونسل میں ۹۰ یونیورسٹیز شامل ہیں، فیڈریشن نے اسکالرشپ اور وظائف دینے اور متعدد اسلامی اداروں کے باصلاحیت طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے باہر بھیجنے کو بھی طے کیا ہے، عربی زبان کا نیا نصاب اور مطالعات اسلامی کا نیا کورس پڑھانے کا فیصلہ بھی فیڈریشن نے کیا ہے۔

(ماخوذ: دعوۃ انگریزی میگزین) ک ص اصلاحی

مطبوعات جدیدہ

تشریح القرآن: از جناب مولانا عبدالکریم پاریکھ، بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، منقش ورنگین جلد، ہدیہ درج نہیں، پتہ: ضیاء پبلی کیشنز، ندوہ روڈ لکھنؤ۔

دینی، تعلیمی اور تبلیغی مساعی کے لیے مولانا عبدالکریم پاریکھ کا نام محتاج تعارف نہیں، ادھر برسوں سے وہ قرآن مجید کے پیغام کو عام کرنے میں مصروف ہیں، درس قرآن کی مجلسوں کے علاوہ وہ کیسٹ اور کاغذ وقلم سے بھی اس مبارک خدمت میں مسلسل سرگرم عمل ہیں، قرآن مجید کا ان کا ایک ترجمہ ۸۷ء میں شایع ہوکر مقبول ہوا، دیگر اور مفید ومستند اور متداول ترجموں کی موجودگی میں اس مقبولیت کا بڑا سبب، آسان اور سادہ زبان اور عام فہم اسلوب ہے، فاضل مترجم کو بھی یہ احساس رہا کہ اس میں ترجمے سے زیادہ ترجمانی کا خیال رکھا گیا، ترجمہ وترجمانی کا فرق اور محل ہر مترجم ومفسر کے پیش نظر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے ترجمے میں دقت ونزاکت اور احتیاط غیر معمولی لحاظ وخیال کی متقاضی ہے، مثلاً ذلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین کا ترجمہ اس طرح کیا گیا کہ "یہ وہ کتاب ہے جس میں شک کی بات نہیں، راہ پر چلا دیتی ہے اللہ کی نافرمانی سے ڈرنے والوں کو" یہاں ترجمہ وترجمانی کا فرق واضح ہے اور یہی انداز ہر جگہ نظر آتا ہے، شاید اسی لیے بعض اہل نظر علما نے اس فرق کو ملحوظ رکھنے کا مشورہ دیا، فاضل مترجم نے کمال دیانت سے ان مشوروں پر استصواب رائے کیا، مولانا علی میاں ندویؒ نے علما کے مشوروں کو عالمانہ اور مخلصانہ قرار دیتے ہوئے اس ترجمہ پر صاد کیا اور اس میں شک نہیں کہ معانی ومطالب کی تفہیم میں آسانی کے ساتھ اصل مدعا سے انحراف بہر حال نہیں ہوا، ترجمے کے علاوہ درس وخطابت کے اسلوب میں تشریحی حواشی بھی ہیں، چند اہل علم ونظر کے کلمات تحسین بھی شاید اسی لیے شامل کیے گئے ہیں کہ شک وتذبذب کی گنجایش نہ رہے، سب سے وقیع سند خود مولانا

سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہے کہ ''یہ ترجمہ تائید الٰہی اور خلوص وجذبۂ دعوت کی بنا پر مفید اور قابل اشاعت ہے''۔

Sufism in South Asia, Impact on Fourteenth Century Muslim Society: از ڈاکٹر ریاض الاسلام، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۹۰، قیمت: ۹۵۰ روپے، پتہ: اینہ سید، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۵-بنگلور ٹاؤن، شارع فیصل، پوسٹ بکس ۱۳۰۳۳، کراچی، پاکستان۔

عالم اسلام کی تاریخ میں چودہویں صدی عیسوی اور اس کے آس پاس کا عہد، سلاطین سے زیادہ حضرات صوفیہ کے حالات وواقعات واثرات سے رنگین وروشن ہے، خصوصاً برصغیر میں ان صوفیہ کی سرگرمیوں سے مورخ صرف نظر نہیں کرسکتا جن کی دنیا صرف خانقاہوں اور سلسلوں تک ہی محدود نہیں تھی، بلکہ حکومت کے ایوانوں، درباروں اور عوامی حلقوں میں بھی ان کا اثر بڑا گہرا محسوس اور واضح تھا، اس قابل قدر کتاب میں ان حضرات صوفیہ کی تعلیمات واخلاقیات کے پہلو بہ پہلو معاشرے پر ان کے اثرات کو موضوع بحث بنایا گیا اور عوام وخواص میں تصوف کے غیر معمولی حسن قبول کا اعتراف کرتے ہوئے کہا گیا کہ بہر حال یہ اصل اسلام (**ORTHODOX ISLAM**) کی تعلیمات سے قابل لحاظ حد تک جدا بھی ہے جس کی وجہ سے مسلم معاشرہ کی روح بھی تغیر وتبدل کے عمل سے متاثر ہوئی، تصوف کے بظاہر عمدہ پہلوؤں کے باوجود یہ سوال تفکر اور محتاط جائزے کا طالب ہے کہ کیا صوفی ازم ایک خالص بخشش وفیضان الٰہی ہے؟ (**Was Sufism an unmixed blessing**) اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کی قیمت کیا ادا کرنا پڑی، معز الدین کیقباد اور قطب الدین مبارک خلجی کے عہد میں جو اعلاً تصوف کی حکمرانی کا دور تھا، صوفیانہ تعلیمات اور صوفیائے کرام کے عملی نمونے، دلی کی اخلاقی پستی کو سنوارنے میں ناکام کیوں نظر آتے ہیں؟ فاضل مصنف نے ان سوالوں اور بقیہ مالہ وماعلیہ پر ایک مورخ ومحقق کی نظر سے واقعی عالمانہ بحث کی ہے، ان کا تعلق علی گڑھ، لاہور، کراچی اور لندن کی جامعات اور دانش گاہوں سے رہا ہے اور یہ

کتاب ان کی برسوں کی محنت، مطالعہ اور مورخانہ ژرف نگاہی کا حاصل ہے، صاف نظر آتا ہے کہ عقیدت ومحبت، تاریخی حقایق کی بازیابی میں ان کی راہ تحقیق میں حائل نہیں ہوئی، بڑی دیانت وامانت سے انہوں نے ایک خاص عہد میں صوفیہ کے اعمال واثرات کو بے کم وکاست بیان کردیا، عموماً تصوف کے ادب میں ایسی جرأت کی مثالیں کم یاب ہیں، انہوں نے قریب دس ابواب میں تاریخی پس منظر میں اسلام، معاشیات اور صوفی ازم، جنوب ایشیا میں نظام فتوح، صوفیوں کا نظریہ کسب، ازدواجی اور عائلی زندگی میں ان کے طور طریق کے علاوہ امام غزالی سے خواجہ گیسودراز تک چند صوفیائے عظام کے سیاسی نظریہ وعمل کا بھی جائزہ لیا، یہ باب خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہے، اس کے علاوہ اخلاقیاتِ صوفیہ کا تنقیدی تجزیہ، مرید ومراد کا باہمی رشتہ اور عقل وعلم اور فکر ونظر پر صوفی اثرات جیسے موضوعات بھی بہت دل چسپ ہیں، ملفوظات و روایات کے بحر طریقت کی شناوری اور غواصی کے بعد فاضل مصنف حقیقت کے کچھ ایسے موتی جمع کرنے میں یقیناً کام یاب ہوئے ہیں جن کی چمک عوام وخواص دونوں کے لیے بصیرت کے درِوا کرنے میں کارآمد ہوسکتی ہے۔

ARTICLES ON IQBAL: از جناب بشیر احمد ڈار، مرتبہ محترمہ شیما مجید، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۰۲، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی، ۱۱۶-میکلوڈ روڈ لاہور، پاکستان۔

اس کتاب کے فاضل مصنف کی شہرت ایک ماہر اقبال شناس کی ہے، ان کے چند اہم مضامین کا یہ مجموعہ بھی اس دعوی کا شاہد عدل ہے جس میں غالب، ملازادہ ضیغم لولابی، محراب گل افغان اور خطاب بہ جاوید کے تعلق سے مضامین کے علاوہ ارتقا اور وحدۃ الوجود جیسے مسایل سے اقبال کی وابستگی پر عالمانہ تحریریں ہیں، اقبال کی ابتدائی نظموں کے تاریخی پس منظر سے بھی بحث کی گئی ہے لیکن سب سے اہم پہلا مضمون ہے جس میں ہندوستان میں مذہبی فکر کے ارتقا پر بڑی معلومات وفکر انگیز گفتگو آگئی ہے، اسلام کی آمد اور تصوف کے رواج کے مختلف مدارج کے ساتھ شنکراچاریہ، رامانج، کبیر، تلسی داس، نانک اور چیتنیہ کی تحریکوں کے پروان چڑھنے کے اسباب اور

ان کے اثرات کی شکل میں روشنیہ، جلالیان، مداریہ اور مہدویہ جیسے فرقوں کے وجود پر یہ بحث پڑھنے کے لایق ہے، اقبال اکادمی لایق تحسین ہے کہ اس نے زیر نظر کتاب کی شکل میں ان قیمتی مضامین کو ایک خوبصورت لڑی میں پروکر پیش کردیا۔

فضا ابن فیضی، فن اور شخصیت: از ڈاکٹر شفیع احمد، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت بہتر، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت: ۱۲۵ روپے، پتہ: شفیع پبلی کیشنز، اورنگ آباد عیدگاہ روڈ، موناتھ بھنجن، یو۔پی۔

اردو شعرا کی موجودہ صف اول میں امتیازی شان کے حامل ہونے کے باوجود جناب فضا ابن فیضی کے فن شعر گوئی پر ان کے بعض معاصر شعرا کی بہ نسبت کم توجہ کی گئی، غزل، نظم اور رباعی میں ان کی قدرت، مشاقی، پختگی اور تجربوں کی جدت وندرت میں اب ان کے ہمسر کم ہی ہیں، ہندو پاکستان کے قریباً تمام موقر ادبی رسالے ان کی شعری کاوشوں کو شایع کر کے خود کو مفتخر سمجھتے ہیں، اس کے باوجود تحقیقی مقالوں کی گرم بازاری میں فضا صاحب سے بے اعتنائی کا جواز نظر نہیں آتا، البتہ اس میں شاید خود ان کی خاموش، غیرت مند اور بے نیاز طبیعت کا بھی دخل ہے، اس کا احساس ان کو بھی ہے، ان کی شاعری میں ایسے مقامات اکثر آتے ہیں جو ان کے مزاج و مذاق طبیعت کو عیاں اور بیاں کرتے ہیں کہ

یہ شخص محو اپنی اداؤں میں رہ گیا

شناسائی کا حوصلہ اگر کیا تو ایسے دلبر ملے جو گلاب بدست تو تھے لیکن دشنہ درآستیں بھی تھے، سر شاخ طوبیٰ، سفینہ زرگل اور سبزۂ معنی بیگانہ جیسے مجموعوں کے شاعر کا حق تھا کہ اس کی فضائے شعر کی وسعتوں کی سیر کی جائے، اس کتاب کے مصنف مبارک باد کے لایق ہیں کہ انہوں نے تحقیقی مقالے کے لیے سب سے موزوں موضوع کا انتخاب کیا اور کوشش کی کہ ایک صاحب فکر و اسلوب شاعری کا مطالعہ سنجیدگی سے کیا جائے، یہ نقش اول ہے لیکن توقع ہے کہ آیندہ یہ اور بہتر مطالعے کے لیے سنگ میل ثابت ہوگا۔

ع۔ص